جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب:......... حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنے فقہی نظریات وخدمات کے آئینے میں
مصنف:........... مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی
ناشر:............... جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور (بہار)
صفحات:........... ۱۱۰/
سن اشاعت:...... ۲۰۰۴ء
تعداد:............. ۱۱۰۰/
قیمت:............. ۴۰/روپے۔
کتابت:.......... الکلام کمپیوٹر اینڈ پرنٹرس، امیر منزل نزد چھتہ مسجد دیوبند

(۱) مکتبہ جامعہ ربانی منورواشریف،
پوسٹ: سوہما، وایا: بتھان، ضلع: سمستی پور (بہار)
(۲) کتب خانہ نعیمیہ دیوبند (یوپی)
(۳) مکتبہ الامام سی ۲۱۲، شاہین باغ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	ابتدائی سطریں	۶
۲	حضرت شاہ صاحبؒ کے عہد کے بعض حالات	۸
	۱	
۳	شاہ صاحبؒ کا فقہی مسلک اور مقام	۱۴
۴	شاہ صاحبؒ کے بارے میں مجتہد منتسب کی رائے	۱۵
۵	حنفیت وشافعیت کی تخصیص کا جائزہ	۲۳
۶	امام احمد بن حنبلؒ کی طرف میلان	۲۴
۷	امام مالکؒ کی طرف میلان	۲۵
۸	زیادہ معتدل نقطۂ نظر	۲۶
۹	فقہی میدان میں تجدیدی خدمات	۳۳
۱۰	شاہ صاحبؒ فقہ حنفی کے مجدد	۳۴
۱۱	شاہ صاحبؒ کو فقہ حنفی کی تقلید کا غیبی اشارہ	۳۴
	۲	
۱۲	حضرت شاہ ولی اللہ کے بعض فقہی نظریات اور مباحث	۳۷
۱۳	فقہ کا رشتہ اس کے اصل سرچشموں سے	۳۷
۱۴	دونوں طریقوں کا انضمام	۳۹
	۳	
۱۵	قرون اولیٰ میں اہل الحدیث اور اہل الرائے	۴۰
۱۶	راہِ اعتدال	۴۷

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱۷	روایت اور درایت کے بارے میں معتدل نقطۂ نظر	۴۸
۱۸	تنقیدی مطالعہ کی ضرورت	۵۰
	۴	
۱۹	اجتہاد .... مفہوم اور مراتب	۵۲
۲۰	مجتہد کا دائرہ عمل	۵۲
	۵	
۲۱	طبقات فقہاء کی مشہور تقسیم اور شاہ صاحبؒ کا نقطۂ نظر	۵۶
	۶	
۲۲	سلسلۂ اجتہاد جاری ہے یا نہیں؟	۵۹
۲۳	اجتہاد منتسب واقعاتی طور پر ممکن ہے	۶۱
	۷	
۲۴	مسئلۂ تقلید	۶۸
۲۵	مذاہب اربعہ کی تخصیص	۷۱
۲۶	تقلید واجب لغیرہ ہے	۷۳
	۸	
۲۷	اختلافات فقہاء کی بحث	۷۶
۲۸	صحابہ کے اختلاف کے دوررس اثرات	۸۱
۲۹	فقہ شافعی پر مختلف مکاتب فقہ کے اثرات	۸۴
۳۰	فقہ حنبلی پر فقہ شافعی کا اثر	۸۴

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۳۱	اختلاف فقہا کا دوسرا سبب	۸۵
۳۲	تعلیل وتوجیہ میں اختلاف	۸۶
۳۳	ردوقبول کے معیار میں اختلاف	۸۷
۳۴	روایات کے جمع وتطبیق میں اختلاف	۸۸
۳۵	اختلافات فقہاء کی شرعی حیثیت	۸۹
۳۶	مسئلہ کا تجزیہ	۹۳
۳۷	فروعی اختلاف دین میں توسع کی علامت	۹۶
۳۸	فی الواقع علم الٰہی کے لحاظ سے اجتہادی اختلاف کا تجزیہ	۹۷
	۹	
۳۹	فقہی مسائل میں شاہ صاحبؒ کا حکیمانہ تفکر	۹۹
۴۰	فقہ فاروقی کے بارے میں دو اہم نکتے	۱۰۰
۴۱	طلاق ثلاثہ کے مسئلے پر شاہ صاحبؒ کا محاکمہ	۱۰۲
	۱۰	
۴۲	فقہ کے موضوع پر شاہ صاحبؒ کی تحریری خدمات	۱۰۴
۴۳	شعبہ تحقیق وتصنیف جامعہ ربانی کی قابل مطالعہ چند اہم کتابیں	۱۱۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائی سطریں

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شخصیت ہندوستان میں علوم اسلامیہ بالخصوص حدیث کے باب میں مرکزی اہمیت کی حامل ہے، ان کی شخصیت اور خدمات کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں، متعدد رسالوں نے ان پر خصوصی نمبر شائع کیے، اور اصحاب علم و تحقیق نے ان کے نام پر علمی و تحقیقی اکیڈمیاں اور ادارے قائم کیے، اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

مگر شاہ صاحبؒ کی قرآنی فکر یا حدیث کے میدان میں ان کی خدمات پر جتنا اچھا کام ہوا، ان کے فقہی کارناموں پر اس قدر نہیں ہوسکا، یہی وجہ ہے کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود آج تک شاہ صاحبؒ کے مسلک فقہی کا معمہ حل نہیں ہوسکا، اسی طرح شاہ صاحبؒ کے مخصوص فقہی نظریات پر تحقیق و تجزیہ کا کام آج تک تشنۂ تکمیل ہے۔

ابھی چند روز قبل بمبئی کے ایک بزرگ عالم دین اور مصنف جامعہ ربانی تشریف لائے تو انہوں نے ذکر کیا کہ شاہ صاحبؒ کے فقہی نظریات پر کوئی مبسوط اور مفصل کتاب پاکستان سے بہت قبل شائع ہوئی تھی، مگر تلاش بسیار کے باوجود وہ کتاب ہاتھ نہیں آسکی!۔

مجھے عہد طالب علمی ہی سے یہ جستجو تھی کہ شاہ صاحبؒ کو سمجھوں، ان کا مقام جانوں، جب سے ہوش سنبھالا ان کا ذکر اپنے کانوں سے سنا، دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تو مسلک دیوبند کو مسلک ولی اللہی سے مربوط بتایا گیا اس لیے مجھے جستجو رہی کہ میں اس عظیم انسان کو سمجھوں، قیام دیوبند کے زمانہ میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' جب پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا تو واقعہ یہ ہے کہ ذہنی طور پر میں الجھ کر رہ گیا، بالخصوص فقہی مسائل میں شاہ صاحبؒ کے تجزیہ و تبصرہ نے میرے درسی تصورات کو کافی صدمہ پہونچایا، میں نے اپنے الجھے ہوئے احساسات، مشکل کو حل کرنے کی غرض سے اپنے

ایک محسن استاذ کو (جن کو میں ہر طرح سے اپنا مربی سمجھتا ہوں اور اس وقت تک میری ساری کائنات اس عظیم استاذ کی شخصیت کے گرد مرکوز تھی) بھیجے، مگر میری سوچ غیر متوازن تھی لب ولہجہ ناپختہ یا ناخوشگوار تھا، محترم موصوف نے میرا پورا پلندہ بغیر کسی جواب کے واپس کر دیا،..... تھوڑی دیر کے لیے مجھے دکھ ضرور ہوا، مگر میری جستجو نے دم نہیں توڑا، پھر میں نے ارادہ کر لیا کہ شاہ صاحبؒ کو ان کی ایک کتاب سے نہیں بلکہ ان کی تمام کتابوں میں تلاش کرنا چاہئے، اسی طرح شاہ صاحبؒ پر اب تک اکابر اہل علم نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی روشنی میں ان کو سمجھنا چاہئے، میرا یہ سفر جس میں سوائے کتابوں کے میرا کوئی رفیق نہیں تھا، برسوں جاری رہا، یہاں تک کہ فقہی طور پر میں شاہ صاحبؒ سے مطمئن ہو گیا، مگر اس موضوع پر کسی تحریر یا مقالہ کی نوبت نہیں آئی۔

حسن اتفاق دہلی میں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے مجھے شاہ صاحبؒ کی فقہی خدمات پر مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی، اگرچہ بعض اسباب کی بنا پر اس سمینار میں میری شرکت نہیں ہو سکی، لیکن اس بہانے میرا وہ سارا حاصل سفر مرتب ہو گیا، جو برسوں کی غیر مرتب اور بے ضابطہ تگ ودو کے بعد میرے ذہن ودماغ نے تیار کیا تھا، یہ کتابچہ دراصل میرے اسی سفر جستجو کی روداد اور خلاصہ ہے۔

میں نے شاہ صاحبؒ کے تمام فقہی نظریات کا احاطہ نہیں کیا ہے، اس کے لیے تو کسی مبسوط کتاب کی ضرورت تھی، میں نے شاہ صاحبؒ کے صرف ان نظریات کو پیش کیا ہے جن سے شاہ صاحبؒ کے فکر وفن کا امتیاز اور تجدیدی خصوصیت سامنے آتی ہو.......

اہل علم سے درخواست ہے کہ کتاب کو ملاحظہ فرمانے کے بعد اپنی قیمتی آراء سے حقیر مرتب کو ضرور آگاہ فرمائیں۔

اختر امام عادل قاسمی

جامعہ ربانی منوروا شریف سمستی پور

۲۸ رصفر المظفر ۱۴۲۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، تیرھوی صدی کی ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ہیں، جنہوں نے ہندوستان کی اسلامی علمی تاریخ کوسب سے زیادہ متاثر کیا، آپ نے ایک نئے عہد اور نئے دور کی بنیاد ڈالی، اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ کونئی علمی اور عقلی بنیادوں پر تعمیر کیا، اسلامی ہند کے زوال سے لے کر سقوط تک ابلکہ آج کی تاریخ تک جوکچھ علمی ودینی سرگرمیاں نظر آرہی ہیں سب اسی خانوادۂ ولی اللہی کا فیض ہے،''جزاھم اللہ منا احسن الجزاء''۔

شاہ صاحب کی تجدیدی مساعی کا دائرہ بہت وسیع ہے، اوراس ایک شخص نے تنہا اتنے کام کئے ہیں کہ ان کوسمیٹنے اور مرتب کرنے کے لیے بھی مستقل ایک اکیڈمی کی ضرورت ہے۔

یوں توشاہ صاحبؒ کا ہرکارنامہ اپنی جگہ اہم ہے، لیکن ان کے کارناموں میں بہت ہی اہم اور مشکل ترین کارنامہ فقہ واجتہاد کے میدان میں ان کی تجدیدی مساعی کا ہے، شاہ صاحبؒ جس دور میں پیدا ہوئے وہ تقلیدی اور فقہی تاریخ کے انتہائی انتشار اور زوال کا دور تھا، حالانکہ کچھ ہی دنوں قبل حصرت عالمگیر اورنگ زیب نے ایک مجلس فقہی قائم کرکے ''فتاوی ہندیہ'' (اور بالفاظ دیگر ''اسلامی ہند کے تحریری اسلامی دستور) کی تدوین کرائی تھی، جس میں حضرت شاہ صاحبؒ کے والد ماجد ومربی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ بھی شریک رہ چکے تھے۔ (حیات ولی: ص ۲۷۷ مرتبہ ابومحمد رحیم بخشؒ)

شاہ صاحبؒ کے عہد کے بعض حالات:

لیکن صدیوں کا علمی وفکری جمود ایک عالمگیر کی چند روزہ کوششوں سے نہیں ٹوٹ سکتا تھا، اس کوتوڑنے کے لیے کسی عظیم مجدد کے تیشۂ تجدید کی ضرورت تھی، حضرت مولانا

مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب ''تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہؒ'' میں اس دور کے بعض حالات کا تذکرہ کیا ہے، ان کو پڑھ کر آج بھی احساسات میں جھرجھری پیدا ہو جاتی ہے، لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدیوں میں بعض خاص حالات خصوصاً اسلام کے اصلی سرچشموں یعنی قرآن وحدیث کی تعلیم سے اسلامی مدارس جس حد تک بیگانے ہوتے چلے گئے، بتدریج یہ اختلاف بہت غلط صورت اختیار کرتا چلا جاتا تھا، خصوصاً ماوراء النہر (ترکستان وخراسان) کے حنفی فقہاء کا غلو اس باب میں آہستہ آہستہ بہت آگے بڑھ گیا تھا، اور ہندوستان میں وطن بنانے کے لیے اسلام جس راستہ سے آیا چونکہ وہ انہی ممالک کا راستہ تھا، اس لیے قدرتاً ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت ان ہی ممالک کے علماء کی ذہنیت سے متاثر تھی، پھر نادری اور ابدالی حملوں نے جب اس ملک میں روہیلوں کے جدید عنصر کا اضافہ کر دیا تو تشدد وتصلب کی یہ شرارت دو آتشہ ہو چکی تھی، (ص:۲۲۱)

علامہ محسن بہاری ترہتی صاحبؒ ''الیانع الجنی'' نے ان کا یہ نقشہ کھینچا ہے۔

''وكانو اشد قوم عصبية لما يتخذونه من آراء فقهائهم رحمهم الله واشد الناس جمودا عليها''

''یعنی جن فقہاء کی پیروی کو ان لوگوں نے اپنا مشرب اور مسلک قرار دیا تھا، ان کے معاملے میں اپنے اندر سخت تعصب رکھتے تھے، اور اس پر شدت سے جمے رہتے تھے''۔

کیدانی جیسی معمولی کتاب کی ایک فقہی روایت (یعنی چاہئے کہ تشہد میں اہل حدیث کے مانند شہادت کی انگلی نمازی نہ اٹھائے) کو صدیوں یہ اہمیت حاصل رہی کہ اگر اتفاقاً نماز میں کسی کی انگلی اٹھ گئی تو اسی وقت اس کی انگلی تراش دی جاتی تھی، علامہ رشید رضا مصری نے ''مغنی'' کے مقدمے میں اپنا یہ بیان درج کیا ہے کہ:

''میں نے اپنے کان سے بعض افغانی طلبہ سے لاہور کی جامع مسجد میں جو

ہندوستان میں واقع ہے، یہ سنا ہے میں نے دراصل ان سے یہ دریافت کیا تھا کہ (انگلی تراشنے کا قصہ) کیا صحیح ہے؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا ہاں! اور اس کی توجیہ یہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور ترک سنت کی یہی سزا دی جاتی ہے"۔

تمباکو جیسی غیر منصوص چیز کی حرمت وحلت پر جو جھگڑا سنا جاتا ہے، پچھلے چند سالوں تک یہ قصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ بیچارے کوٹہ ملا نے تمباکو کی حلت کا فتویٰ دے دیا تھا، پھر کیا تھا مختلف جرگوں کے مجاہد دینی حمیت وغیرت کے نشہ میں چور اپنے ملانوں کے زیر کمان باضابطہ مسلح ہو ہو کر کوٹہ ملا پر چڑھ دوڑے، راستہ میں اس دینی جہاد کی مہم پر جو رجز پڑھا جاتا تھا، میرے ایک دوست نے ہم سے یہ بیان کیا تھا کہ وہ یہ تھا:

"کوٹہ ملا کا پردی جو ساک شدہ ہم کا پردے"

"یعنی کوٹہ ملا کافر ہے اور جو اس کے ساتھ ہے وہ بھی کافر ہے"۔

میرے ایک اور سرحدی ہم سبق کہتے ہیں کہ تمباکو کی حرمت کے جو لوگ قائل تھے، ان کا تشدد اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ جس کھیت میں تمباکو بویا جائے اس کھیت کے اطراف سے بیلوں پر غلہ لاد کر جو کوئی گذرے گا اس کا غلہ بھی حرام ہو جائے گا۔

(تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ص ۱۸۹)

الیانع الجنی کے مولف نے حضرت شاہ صاحبؒ کے زمانہ کے حنفی روہیلوں کی حنفیت صلبہ، یا سنگین ملایانہ حنفیت، کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ:

"ان کا حال یہ تھا کہ جب ان کے کان میں کوئی ایسی بات پہونچتی جو ان کے اس تقلیدی امر کے خلاف ہوتی جسے کل وہ اچھا سمجھتے تھے، تو خواہ کوئی ہوتا اس پر یہ چڑھ بیٹھتے، جس کے منہ سے ایسی مخالف بات نکلی ہوتی، غصہ سے اس کے مقابلے میں بھڑ جاتا، اس کی گردن کی رگیں پھول جاتیں، اس کے رخسارے سرخ ہو جاتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ جھاؤ کی لکڑی کے انگارے ہیں، (ص:۸۳)

ہندوستان میں رہ پڑنے کے بعد اگرچہ اب ان کی پچھلی نسلوں میں وہ کرختگی اور تصلب تو باقی نہیں رہا لیکن جواب تک ان ہی پتھریلے کوہستانوں میں رہتے ہیں، ان کی دینی سختی کا حال جیسا کہ سید رشید رضا مصری نے لکھا ہے وہی ہے، لکھتے ہیں:

''ان کی سختیوں کی داستانوں میں ایک قصہ یہ ہے جو بعض افغانی حنفیوں کے متعلق سنا جاتا ہے کہ اس نے جماعت میں اپنے برابر والے کو دیکھا کہ وہ سورۂ فاتحہ (امام کے پیچھے) پڑھ رہا ہے، تو اس افغانی نے اس بیچارے فاتحہ پڑھنے والے کے سینے پر اس زور سے دوہتڑ اماڑا کہ وہ بیچارہ پیٹھ کے بل زمین پر گر پڑا، اور قریب تھا کہ مر جائے، اور مجھے یہ خبر ملی ہے کہ ایسے ہی ایک شخص نے تشہد کی انگلی نماز میں اٹھائی تو بعض افغانوں نے اسکی انگلی توڑ دی، (مقدمہ مغنی: ص۱۶ر)

خود حضرت شاہ ولی اللہؒ (جنہوں نے ردشیعت پر ازالۃ الخفا اور قرۃ العنین جیسی کتابیں تحریر فرمائیں) بھی ان کے ناوک تعصب سے محفوظ نہ رہ سکے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی بیان فرماتے ہیں:

''شخصے از والا ماجد مسئلہ تکفیر شیعی پرسید، آنحضرت اختلاف حنفیہ کہ دریں باب است، بیان کردند چوں مکرر پرسید ہماں شنید، شنیدم می گفت ایں شیعی است''

ترجمہ: یعنی ایک شخص نے والد ماجد سے شیعوں کی تکفیر کے متعلق سوال کیا، فقہاء حنفیہ کا اس باب میں جو اختلاف ہے والد ماجد نے اس کو بیان فرمایا، غریب روہیلہ، پہلی دفعہ تو یہ سن کر چپ رہا اور پھر دہرا کر ذرا اصرار سے اپنے منشاء کو ظاہر کرتے ہوئے جب اس نے دوبارہ وہی بات پوچھی تو جواب میں پھر وہی سنا، دوسری دفعہ اس کا یہ سننا تھا کہ آگ بگولا ہو گیا، جن کو وہ قطعی کافر سمجھتا تھا ان کے کفر کے متعلق اختلاف سننا اور دوبارہ پوچھنے کے بعد بھی یہی سننا ناقابل برداشت ہو گیا، حضرت سے فتویٰ پوچھتے پوچھتے الٹ کر وہ خود مفتی بن بیٹھا، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں، میں نے سنا وہ کہتا تھا کہ یہ (یعنی شاہ

ولی اللہ) شیعی ہے''۔(تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ:ص۱۹۲ر)

حضرت شاہ صاحب نے''الانصاف''اور''حجۃ اللّٰہ''میں اپنے دور کے فقہاء کی جو تصویر کشی کی ہے اس سے بھی اس دور کے فقہی جمود اور غالیانہ تعصب کا اندازہ ہوتا ہے، عربی عبارتوں سے مضمون کو گرنبار اور طویل کرنے کے بجائے ترجمہ ومفہوم پر اکتفا کرتا ہوں۔

''الانصاف''میں رقم طراز ہیں:

''اس زمانہ میں فقیہ اس شخص کا نام ہے، جو باتونی ہو، زور زور سے ایک جبڑے کو دوسرے جبڑے پر ٹیکتا ہو، جو فقہاء کے اقوال قوی ہوں یا ضعیف سب کو یاد کر کے بغیر اس امتیاز کے کہ ان میں سے کس میں قوت ہے اور کس میں نہیں ہے، وہ انہیں اپنے جبڑوں کے زور سے بیان کرتا رہے''۔(ص:۹۳)

اسی گروہ کے متعلق ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

''ان کی بے تمیزیوں اور جہالت کا حال یہ ہے کہ طویل وضخیم کتب فتاویٰ میں جتنے اقوال ومسائل ہیں سب کو امام ابوحنیفہ اور صاحبین کا قول سمجھتے ہیں، وہ ان اقوال میں یہ تمیز نہیں کرتے کہ فلاں قول ان ائمہ کا واقعی ہے اور فلاں قول ان کی رایوں اور فتووں کو سامنے رکھ کر بعد میں مستنبط کیا گیا ہے، اور یہ جو ان کتابوں میں''**علی تخریج الکرخی کذا**''اور''**علی تخریج الطحاوی کذا**''کے الفاظ آیا کرتے ہیں، ان کو وہ گویا بے معنی سمجھتے ہیں، اسی طرح **قال ابو حنیفۃؒ** (امام ابوحنیفہؒ نے یوں فرمایا ہے،) اور **جواب المسئلۃ علی مذھب ابی حنیفۃ کذا** (امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے مطابق مسئلہ کا جواب یوں ہے،) کے درمیان وہ کوئی فرق وامتیاز نہیں کرتے، اور ابن الہمام وغیرہ محققین حنفیہ کا مسئلہ دہ دردہ اور مسئلہ شرط تیمّم اور ایسے دوسرے مسائل کے بارے میں یہ فرمانا کہ دراصل یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول نہیں ہے، بلکہ بعد والوں کی تخریجات ہیں، ان کے نزدیک

بالکل نا قابل اعتناء ہے۔(ص:۸۶)

بلکہ بہت سے لوگوں نے تو عزت و دولت ، یا عہدہ و منصب کے حصول کے لیے فقہ وفتاویٰ کا شغل اختیار کر رکھا تھا۔

فاصبح الفقهاء بعد ما كانوا مطلوبين طالبين و بعدان كانوا اعزة بالاعراض عن السلاطين اذلة بالاقبال عليهم(ص:۸۱)

''یعنی پھر یہ ہوا کہ فقہاء پہلے مطلوب تھے اور اب طالب بن گئے، اور سلاطین سے دور رہنے کے باعث جو عزت ان کو حاصل تھی ان سے تعلق کی بنا پر وہ جاتی رہی''۔

یہ حالات تھے جن میں شاہ صاحبؒ نے اپنی فقہی اور اجتہادی خدمات کا آغاز کیا، اجتہاد کا مفہوم واضح کیا، اس کے لیے ضروری شرائط اور دائرہ کار کی تحدید فرمائی، قرآن وحدیث سے مسائل کے اخذ واستنباط پر روشنی ڈالی، تقلید کی حقیقت سے بحث کی اور اس کے بارے میں نقطۂ عدل پیش فرمایا، فقہاء کے اختلاف کے اسباب اور ان کی شرعی حیثیت کو منقح کیا، اور مختلف ابواب فقہیہ میں پیدا شدہ شدتوں کو کم کرنے کی سعی بلیغ فرمائی وغیرہ''۔

ایسا نہیں تھا کہ شاہ صاحبؒ نے اسلاف سے ہٹ کر کوئی نئی بات پیش فرما دی تھی، باتیں وہی تھیں مگر تجزیہ و ترتیب نئی تھی، حقائق وہی تھے جو سابقہ فقہاء اور علماء نے بیان کیے تھے بس انہوں نے ان پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹا دیا تھا، اسی لیے شاہ صاحبؒ نے اس تعلق سے کوئی بات محض اپنے طور پر پیش نہیں کی ہے، بلکہ اس کو قرآن وحدیث اور تحقیقات سلف سے مبرہن کیا ہے، اور ایسے معقول، جدید ترین اور سائنٹفک انداز میں پیش کیا ہے کہ بڑے سے بڑے مدعیان علم وتحقیق کے لیے ان کا انکار کرنا مشکل ہے۔

۱

شاہ صاحبؒ کا فقہی مسلک اور مقام

شاہ صاحبؒ کی فقہی خدمات پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ شاہ صاحبؒ کے مسلک اور مقام کو سمجھ لیا جائے، تا کہ ان کی خدمات اور کارناموں کی حقیقی نوعیت اور صحیح حیثیت کا تعین آسان ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی شخصیت اس قدر ہمہ جہت اور آپ کی تحریرات اتنی متنوع ہیں کہ ان کے مسلک کا تعین حد درجہ پیچیدہ ہو گیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف اصحاب مسالک ان کو اپنا ہم نوا اور ہم مسلک ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور ہر ایک کی تائید میں کچھ نہ کچھ عبارات اور اقتباسات مل ہی جاتی ہیں۔

نواب صدیق حسن خانؒ نے "اتحاف النبلاء" میں لکھا ہے:

اگر وجود او در صدر اول در زمانہ ماضی بود امام الائمہ تاج المجتہدین شمردہ می شد۔

(ظفر المحصلین: ص ۵۸)

ترجمہ: اگر شاہ صاحبؒ کا وجود گزشتہ زمانے میں صدر اول میں ہوتا تو مجتہدوں کے پیشوا اور سرتاج مانے جاتے اور امام الائمہ کا گراں قدر خطاب پاتے"۔

مشہور مورخ علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے بھی اپنی کتاب "نزہۃ الخواطر" میں شاہ صاحبؒ کو امام الائمہ اور آخر المجتہدین، قرار دیا ہے،

(الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام: ج ۶ ر ص ۴۱۰)

اور بڑے بڑے معاصر اور اکابر کے خیالات شاہ صاحبؒ کے مناقب میں پیش

کیئے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے بارے میں مجتہد منتسب کی رائے:

ان کے علاوہ اور بھی کئی حضرات نے شاہ صاحبؒ کو مجتہد اور امام وغیرہ کے القاب سے یاد کیا ہے، اگرچہ اس تعبیر کا ہمارے عرف میں خاص اصطلاحی مجتہد کے ہم معنی ہونا ضروری نہیں، بلکہ ہر ایسے شخص کے لیے اس کا اطلاق کیا جاتا ہے، جو عہد ساز اور انقلابی کارنامہ انجام دے، اور جو علمی وفکری طور پر امت کے ایک بڑے طبقے پر اثر انداز ہو، مگر یہاں شاہ صاحبؒ کو بعض حضرات نے فقہی اصطلاح میں بھی مجتہد تسلیم کیا ہے، اور ان کی خدمات علمیہ کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے، شاہ صاحبؒ کی شاہکار تصنیف ''المسوّی شرح المؤطا'' ''دار الکتب العلمیة، بیروت لبنان'' سے چھپی ہے، اس پر علماء کی ایک جماعت نے کام کیا ہے، ابتداء کتاب میں شاہ صاحبؒ کی شخصیت اور کتاب کے تعارف پر مختصر تمہیدی تحریر ہے، اس میں شاہ صاحبؒ کو مجتہد مطلق منتسب قرار دیا گیا ہے، البتہ اس انتساب کو کسی ایک مذہب سے جوڑنے کے بجائے مذہب حنفی اور شافعی دونوں سے جوڑا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے، کہ ان کے دائرہ تدریس میں دونوں مذاہب شامل تھے، علاوہ ازیں شاہ صاحبؒ نے ائمہ مجتہدین کی فقہی آراء کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

کان آیة من آیات اللّٰہ تعالیٰ اماماً فی علوم الدین بلغ رتبة المجتہد المطلق المنتسب فی المذہب الحنفی والشافعی فکان یدرس المذہبین وکان یضاھی الائمة المستقلین بالاجتہاد فی بعض شؤونہم، (ص:۸/ر)

اس تصور کی اصل بنیاد شاہ صاحبؒ کی وہ عبارات ہیں .... جن میں انہوں نے اپنے طرز فکر کو ان فقہاء محدثین کے طرز فکر اور طریقۂ اجتہاد سے وابستہ کیا ہے اور اس کو اپنے لیے پسندیدہ راہ عمل قرار دیا ہے، جنہوں نے ذخیرۂ احادیث اور اقوال فقہاء دونوں کو اپنے پیش نظر رکھا اور قرآن وحدیث کو اساس قرار دے کر اقوال فقہیہ کو ان پر پیش کیا مثلاً

حجۃ اللہ البالغۃ میں اہل الحدیث اور اہل الرائے دونوں طبقات کے نقطہائے نظر اور طریقۂ کار پر مبسوط علمی تبصرہ کرنے کے بعد "فیصلہ کن طور پر تحریر فرماتے ہیں کہ ایک معتدل اور محقق فقیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں نقطۂ نظر کے درمیان تطبیق کا راستہ اختیار کرے اور دونوں طرز فکر اور منہج استنباط سے استفادہ کرے۔

ولما کان الامر کذلك وجب علی الخائض فی الفقه ان یکون متضلعاً من کلا المشربین ومتبحراً فی کلا المذهبین وکان احسن شعائر الملة ماجمع علیه جمهور الرواة وحملة العلم وتطابق فیه الطریقتان جمیعاً والله اعلم (حجۃ اللہ البالغۃ: ص۱۳۷؍مطبوعہ دیوبند)

"الجزء اللطیف فی ترجمة العبد الضعیف" میں تحریر فرماتے ہیں:

بعد ملاحظۂ کتب مذاہب اربعہ واصول فقہ ایشاں واحادیث کہ متمسک ایشاں است قرارداد خاطر بمدد نور غیبی روش فقہاء محدثین افتاد بعد از اں شوقِ زیارت حرمین درسر افتا

(الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف مشمولہ انفاس العارفین مطبع مجتبائی: ص۲۰۳-۲۰۴)

ترجمہ: مذاہب اربعہ اوران کے اصول فقہ کی کتابوں کے مطالعہ اور جن احادیث سے وہ استدلال کرتے ہیں ان پر غور وفکر کرنے کے بعد طبیعت کو فقہاء محدثین کی روش پسندیدہ معلوم ہوئی، اس میں نور غیبی کی مدد بھی شامل تھی۔ اس کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق دامن گیر ہوا"۔

اپنے فارسی وصیت نامے میں تحریر فرماتے ہیں:

"درفروع پیروی علماء محدثین کہ جامع باشند میان فقہ وحدیث کردن و ......تفریعات فقہیہ را بر کتاب وسنت عرض نمودن (ص:۲؍بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت: ج۵؍ص۲۰۲)

ترجمہ: فروعی مسائل میں ایسے علماء محدثین کی پیروی کرنی چاہئے، جو فقہ وحدیث دونوں کے عالم ہوں اور مسائل فقہیہ کو ہمیشہ کلام اللہ اور حدیث رسول ﷺ پر

پیش کرنا چاہئے''۔

آگے تحریر فرماتے ہیں:

''امت راہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب وسنت استغناء حاصل نیست (ص:۳۰)

ترجمہ: امت کے لیے قیاسی مسائل کا کلام اللہ اور حدیث رسول ﷺ سے تقابل کرتے رہنا ضروری ہے، اس سے کبھی بے نیازی نہیں ہوسکتی''۔

دوسری طرف شاہ صاحبؒ نے ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید ''میں مجتہد مطلق منتسب کی تعریف، شرائط اور اس کے کاموں پر جو تفصیلی گفتگو کی ہے، اس کا حاصل گفتگو خود انہی کی زبان میں یہ ہے:

وحاصل کل ذلك انه جامع بين علم الحديث و الفقه المروى عن اصحابه واصول الفقه كحال كبار العلماء من الشافعية ....وحاصل صنيعهم على مااستقرينا من كلامهم ان تعرض المسائل المنقولة عن مالك والشافعي وابى حنيفة والثورى وغيرهم رضى اللّٰه عنهم من المجتهدين المقبولة مذاهبهم وفتاواهم على مؤطامالك والصحيحين ثم على احاديث الترمذى وابى داؤد فاىّ مسئلة وافقتها السنة نصاً اواشارة اخذ وابهاوعولوا عليها واى مسئلة خالفتها السنة مخالفة صريحة ردوها وتركوا العمل بها واى مسئلة اختلفت فيها الاحاديث والآثار اجتهدوا فى تطبيق بعضها ببعض، (ص:۴۰،مطبوعہ ترکی)

ترجمہ: ان سب کا حاصل یہ ہے کہ مجتہد مطلق منتسب علم حدیث، علم فقہ (جو کہ اصحاب فقہ سے منقول ہو) اور علم اصول فقہ کا جامع ہو، جیسا کہ اکابر علماء شافعیہ کا حال ہے، ان کے طرز عمل کا حاصل (ہمارے استقراء کے مطابق) یہ ہے کہ فقہاء (امام مالک، شافعی، ابوحنیفہ، ثوری وغیرہ مجتہدین جن کے مذاہب نے امت میں قبول عام حاصل کیا) سے

منقول مسائل اور فتاویٰ کو موطا مالک، بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد وغیرہ کی احادیث پر پیش کرے، جو مسئلہ حدیث کے موافق ہو، صراحۃ یا اشارۃ، اس کو قبول کرے، اور جو صراحۃ مخالف ہو اس کو رد کرے، اور اس پر عمل نہ کرے، اور جس مسئلے میں احادیث وآثار کا اختلاف ہو ان میں اجتہاد سے تطبیق دینے کی کوشش کرے"۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: **سنن بیہقی، معالم السنن**، اور **شرح السنة للبغوی** اس طرز تحقیق واجتہاد کی بہترین مثالیں ہے، پھر فرماتے ہیں:

فهذه طريقة المحققين من فقهاء المحدثين فقليل ماهم وهم غير الظاهرية من اهل الحديث الذين لايقولون بالقياس ولابالاجماع وغير المتقدمين من اصحاب الحديث ممن لم يلتفتوا الى اقوال المجتهدين اصلا ولكنهم اشبه الناس باصحاب الحديث لانهم صنعوا فى اقوال المجتهدين ماصنع اولئك فى مسائل الصحابة والتابعين (ص:۴۰)

ترجمہ: یہ محققین فقہاء محدثین کا طریقہ ہے، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے، یہ اہل حدیث کے اصحاب ظواہر نہیں ہیں، جو قیاس اور اجماع کے قائل نہیں اور نہ متقدمین محدثین کا طرز ان سے میل کھاتا ہے، جو مجتہدین کے اقوال کو قابل اعتناء ہی نہیں سمجھتے، البتہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ان کا رویہ محدثین سے قریب تر ہے، اس لیے کہ ان حضرات نے اقوال مجتہدین کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو ان حضرات محدثین نے صحابہ اور تابعین کے مسائل کے ساتھ کیا"۔

غالباً انہی تحریرات کے آئینے میں شاہ صاحبؒ کے بارے میں مذکورہ تصور قائم کیا گیا، چنانچہ مذکورہ تصور کے بعض حاملین نے شاہ صاحبؒ کے مذکورہ طرز تحقیق کا حوالہ بھی دیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نظریے کے پیچھے شاہ صاحبؒ کی یہی تحریرات کارفرما ہیں، ....علامہ عبدالحی لکھنوی رقم طراز ہیں:

وخاض فی بحار المذاهب الاربعة واصول فقههم خوضا بليغا ونظر فی الاحاديث التی هی متمسکاتهم فی الاحکام وارتضیٰ من بينها بامداد النور الغيبی طريق الفقهاء المحدثين .

(الاعلام فی تاريخ الهند من الاعلام:ج۶رص۴۱۱رمطبوعہ رائے بریلی)

''یعنی شاہ صاحبؒ نے مذاہب اربعہ اور ان کے اصول فقہ کا گہرا مطالعہ کیا اور احکام سے متعلق ان کی مستدل احادیث کا جائزہ لیا اور نور غیبی کی مدد سے فقہاء محدثین کا طریق اختیار کیا''

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

والهمه الجمع بين الفقه والحديث(ج:۶رص:۴۱۵ر)

ترجمه: اللہ نے فقہ وحدیث کو جمع کرنے کی بات ان کے دل میں ڈالی۔

المسوی شرح المؤطا پر کام کرنے والی جماعت نے شاہ صاحبؒ کے مسلک پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

مسلكه هو التوسط والاعتدال والجمع بين صحيح المنقول والمعقول وبين طريقة الفقهاء والمحدثين ۔

(کتاب المسوی شرح المؤطا:ص۸ر)

یعنی شاہ صاحبؒ کا مسلک توسط اور اعتدال ،منقول اور معقول اور طریق فقہاء اور طریق محدثین کی جامعیت تھی''۔

حیات ولی کے مصنف نے حضرت شاہ صاحبؒ کے مسلک سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے،لیکن ایک مقام پر ایک خاص مناسبت سے شاہ صاحبؒ کے مسلک کا ذکر آ گیا ہے،تو وہی ''**جزء اللطيف**'' کی عبارت کے حوالے سے شاہ صاحبؒ کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ:

انجام کار نور غیبی کی تائید سے مجھے فقہاء محدثین کی روش بھلی معلوم ہوئی اور انہیں

کے مسلک کو میں نے اختیار کر لیا۔ (حیات ولی:ص۴۲۲ر)

لیکن اس رائے کو تسلیم کرنے میں کئی مشکلات ہیں، بڑی مشکل یہ ہے کہ اس طبقہ کے افراد تاریخ اسلامی میں بہت نادرالوجود ہیں، اس منصب کے اطلاق کے لیے فقہ واصول فقہ اور فتاویٰ کے میدان میں بے مثال اور وسیع خدمات کی ضرورت ہے، شاہ صاحبؒ کی خدمات علمیہ کا دائرہ متنوع اور بے مثال سہی، اسی طرح ان کے یہاں جو شان تجدید اور عبقریت پائی جاتی ہے، اس کی انفرادیت اور امتیاز بھی مسلم ہے، لیکن اس کے باوجود خاص فقہ واصول فقہ اور فتاویٰ کے میدان میں شاہ صاحبؒ کا کام انتہائی مختصر اور اصولی حیثیت کا ہے، وہ اتنا مفصل، وسیع اور عمیق نہیں ہے، کہ اس عظیم الشان منصب کا اطلاق اس پر ہو سکے، شاہ صاحبؒ کو اس عہدہ کی عظمت اور نزاکت کا پورا احساس ہے، اور شاہ صاحبؒ اس حقیقت سے بھی پوری طرح آشنا ہیں کہ اس منصب کا اطلاق بہت کم لوگوں پر ہو سکا ہے، شاہ صاحبؒ نے مثال میں کبار علماء شافعیہ کا ذکر کیا ہے، اور پھر تحریر فرماتے ہیں:

وهم ان كانوا كثيرين فى انفسهم لكنهم اقلون بالنظر الى المنازل الاخرىٰ (عقد الجید:ص۴۰ر)

ترجمہ: اس طبقہ کے افراد اگرچہ بطور خود بہت ہوں، لیکن دیگر امور پر نظر ڈالی جائے تو ان کی تعداد بہت کم ہے''۔

ایک اور مقام پر اس بحث کے آخر میں بیہقی اور بغوی جیسے فقہاء، محدثین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقليل ماهم۔ (۴۰)

یعنی اس طرز فکر کے حامل اور اس سطح کے محققین فقہاء محدثین بہت کمیاب ہیں۔

شاہ صاحبؒ کا بار بار یہ احساس دلانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ اس عہدہ کو بہت محتاط اور نازک تصور کرتے ہیں، اور اپنے بارے میں اس تعلق سے کسی استحقاق کا

احساس نہیں رکھتے، ان کے یہاں خواہ مخواہ کا تکلف یا تواضع نہیں ہے، شاہ صاحبؒ نے بڑی صفائی کے ساتھ اپنے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے، اور اپنے کاموں کی حیثیت بھی واضح کی ہے، (جس کو بلاشبہ تحدیث نعمت ہی کہا جاسکتا ہے) چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

تفہیمات میں تحریر فرماتے ہیں:

☆ جب میرا دائرہ حکمت یعنی علم اسرار دین پورا ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے خلعت مجددیت پہنائی، پس میں نے اختلافی مسائل میں جمع و تطبیق کو معلوم کر لیا"۔

☆ مجھے خدا نے یہ شرف بخشا ہے کہ میں اس زمانہ کا مجدد، وصی اور قطب ہوں، اگر خدا نے چاہا تو میری کوششوں سے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہو جائے گی۔

(بحوالہ ظفر المخلصین: ص/۵۷)

مجدد کے منصب کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ شریعت کے قوانین کی توجیہ و تفسیر کتاب وسنت کے مطابق کرے، اور اس میں قیاس کو ہرگز دخل نہ دے، تعلیمات و نظریات، کو پیش کرتے وقت صحابہ و تابعین کے اعمال وافعال کو بھی سامنے رکھے۔

وصی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دین کے ان قوانین کو جو بتاتے ہیں کہ حرام کیا ہے، اور حلال کیا ہے، رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور ان کے ارشادات کی روشنی میں ترتیب دے۔

قطب وہ ہے: جو خدا کی مرضی کو موجودہ حالات وضروریات میں بنی نوع انسان پر ظاہر کر دے۔

☆ مجھ پر اللہ تعالیٰ کے خاص احسانات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے مجھے اس آخری دور کا ناطق، حکیم، قائد اور زعیم بنایا۔ (تفہیمات)

☆ میرے ذہن میں ڈالا گیا کہ میں لوگوں تک یہ حقیقت پہونچادوں کہ یہ زمانہ تیرا زمانہ ہے اور یہ وقت تیرا وقت ہے۔ افسوس اس پر جو تیرے جھنڈے کے نیچے نہ ہو۔ (ایضا)

☆ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں قائم الزمان ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ جب خیر کے کسی نظام کا ارادہ فرماتے ہیں، تو اپنے اس ارادہ کی تکمیل کے لیے مجھے آلۂ کار بناتے ہیں، (فیوض الحرمین)

☆ حق تعالیٰ کا عظیم ترین انعام اس بندۂ ضعیف پر یہ ہے کہ اس کو خلعت فاتحیہ بخشا گیا ہے، اور اس آخری دور کا افتتاح اس سے کرایا گیا ہے، (حجة اللّٰه البالغة)

☆ خداوند تعالیٰ نے ایک وقت میں میرے قلب میں میزان پیدا کردی، جس کی وجہ سے میں ہر اس اختلاف کا سبب جان لیتا ہوں جو امت محمدیہ میں واقع ہوا، اور اس کو بھی پہچان لتیا ہوں، جو خدا اور اس کے رسول کے نزدیک حق ہے، اور خدا نے مجھے یہ بھی قدرت دی ہے کہ امر حق کو دلائل عقلیہ نقلیہ سے اس طرح ثابت کردوں کہ اس میں کسی قسم کا شبہ اور اشکال باقی نہ رہے، (ایضا، بحوالہ ظفر المحصلین :ص۵۹ر)

ظاہر ہے کہ اتنی صاف گوئی اور حقیقت پسندی کے باوجود شاہ صاحبؒ کا اپنے بارے میں اس فقیہانہ منصب کی طرف کوئی اشارہ نہ کرنا بلا وجہ نہیں ہے، اور واقعہ بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ شاہ صاحبؒ بہت کچھ تھے، وہ سب کچھ جس کا انہوں نے اپنی تحریرات میں ذکر کیا ہے'' مگر خدمات اور ان کے نتائج کی روشنی میں مجتہد منتسب نہیں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ شاہ صاحبؒ سے ایک نئے علمی دور کا آغاز ہوا، نئی اساسیات وجود میں آئیں، نئی زبان اور نئی فکر تشکیل پائی انہوں نے نئے عقلی دور کے مطابق کلام کیا، اور پوری ایک تاریخ اور ایک عہد کو جنم دیا، سب ہی کو اس کا اعتراف ہے، مگر وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاہ صاحبؒ نے کسی خاص مکتب فقہی کی بنیاد نہیں رکھی، نہ کسی امام کے اصول فقہیہ کو نیا رنگ و آہنگ دیا، اور نہ فقہی جزئیات ومسائل سے زیادہ تفصیلی طور پر بحث کی، انہوں نے تمام علوم ومراحل زندگی کی طرح اس باب کے بھی صرف ان حصوں پر انگلی رکھی جہاں کمزوری کا احساس ہوا اور اپنی قوت تجدید سے اس کی اصلاح کی کوشش کی، یہی وجہ ہے کہ ان کی مخصوص فقہی آراء کو وہ

قبول عام حاصل نہیں ہوا، جو ان کی انقلابی اور تجدیدی فکر کو ہوا، بلکہ فقہی طور پر ان کی شخصیت یکلخت غیر واضح سی ہو کر رہ گئی، اگر وہ کسی مذہب کے مجتہد منتسب ہوتے تو ان کا فقہی رجحان بھی بہت واضح ہوتا، اور ان کی تحریرات وتصنیفات کا کوئی ایک رخ متعین ہوتا۔

حنفیت وشافعیت کی تخصیص کا جائزہ:

علاوہ ازیں اگر ان کی مذکورہ شان اجتہاد کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا انتساب کس مذہب کی طرف کیا جائے، یہ طے کرنا آسان نہیں ہے، المسوی پر کام کرنے والی جماعت علماء کا خیال ہے کہ انتساب ایک مذہب کی طرف کرنے کے بجائے مذہب حنفی اور مذہب شافعی دونوں کی طرف کیا جائے (المسوی: ص ۸)

ان دونوں مذاہب کی تخصیص کی بنیاد غالبا بخاری شریف کا وہ قلمی نسخہ ہے، جو خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے، یہ نسخہ شاہ صاحبؒ کے درس میں رہا ہے، اس میں آپ کے تلمیذ محمد بن محمد بن شیخ ابوالفتح نے پڑھا ہے، تلمیذ موصوف نے درس بخاری کے ختم کی تاریخ ۶ رشوال ۱۱۵۹ھ لکھی ہے، اور جن کے قریب جامع فیروزی میں ختم ہونا لکھا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے دست مبارک سے اپنی سند امام بخاریؒ تک تحریر فرما کر تلمیذ مذکور کے لیے سند اجازت لکھی ہے، اور آخر میں اپنے نام کے ساتھ یہ کلمات تحریر فرمائے:

العمری نسباً، الدهلوی وطناً، الاشعری عقیدة، الصوفی طریقة، الحنفی عملاً والشافعی تدریساً خادم التفسیر والحدیث والفقه والعربية والکلام، ۲۳ رشوال ۱۱۵۹ھ"۔

اس تحریر کے نیچے شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ کی یہ عبارت لکھی ہے، کہ بیشک یہ تحریر بالا میرے والد محترم کے قلم کی لکھی ہوئی ہے، نیز شاہ عالم کی مہر بھی بطور تصدیق ثبت ہے"۔ (بحوالہ ظفر المحصلین: ص ۶۲)

بلاشبہ یہ ایک مضبوط بنیاد ہے، جس سے شاہ صاحبؒ کا رجحان مذہب حنفی وشافعی کی

طرف ثابت ہوتا ہے، مگر اس کے علاوہ بعض کئی چیزیں ایسی بھی ہیں جن سے شاہ صاحبؒ کا رجحان دوسرے مذاہب کی طرف محسوس ہوتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کی طرف میلان:

مثلاً شاہ صاحبؒ جس خاص مشرب فقہی کے وکیل اور علمبردار نظر آتے ہیں وہ ہے ''جمع بین الحدیث و الفقہ'' جو شاہ صاحبؒ کے نزدیک محققین فقہاء محدثین کا طریقہ رہا ہے، متعدد تذکرہ نگاروں نے شاہ صاحبؒ کے اس مشرب کا ذکر کیا ہے، اگر یہ درست ہے اور بلاشبہ درست ہے، تو اس لحاظ سے شاہ صاحبؒ امام احمد بن حنبلؒ کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔

''حجة اللّٰه البالغة'' کا ''باب الفرق بین اهل الحدیث و اصحاب الرائی'' شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، شاہ صاحبؒ کا صریح رجحان ''اهل الحدیث'' کی طرف محسوس ہوگا، مگر ''اهل الحدیث' ' سے مراد نہ غیر مقلدین ہیں اور نہ نرے محدثین، بلکہ ''اهل الحدیث'' سے مراد شاہ صاحبؒ کے نزدیک محدثین فقہاء ہیں، جو فقہ کی بنیاد ترجیحی طور پر احادیث و آثار پر رکھتے ہیں، اور فقہی مجتہدات اور اصول فقہ کو ثانوی درجہ دیتے ہیں، یہ قیاس یا اجماع کے منکر نہیں ہیں، لیکن احادیث و آثار پر زیادہ زور صرف کرتے ہیں، شاہ صاحبؒ کے نزدیک اس طبقہ کے سرخیل اور پوری جماعت میں سب سے عظیم المرتبت شخص امام احمد بن حنبلؒ ہیں لکھتے ہیں: ''وبالجملة فلما مهدوا الفقه علی هذه القواعد فلم تکن مسئلة من المسائل التی تکلم فیها من قبلهم و التی وقعت فی زمانهم الا وجدوا فیها حدیثا مرفوعا متصلا او مرسلا او موقوفا صحیحا او حسنا او صالحا للاعتبار او وجدوا اثر ا من آثار الشیخین او سائر الخلفاء و قضاء الامصار و فقهاء البلدان او استنباط من عموم او ایماء او اقتضاء فیسر اللّٰه لهم العمل بالسنة علیٰ هذه الوجه و کان اعظمهم شاناً و اوسعهم

روایة واعرهم للحدیث مرتبة واعمقهم احمد بن حنبل ثم اسحٰق بن راھویه "(حجة اللّٰه البالغة: ج ۱ ص ۱۵۰)

ترجمہ: خلاصہ یہ کہ جب ان حضرات نے فقہ کی بنیاد ان قواعد پر رکھی تو کوئی مسئلہ ایسا نہیں تھا جو ان کے دور میں پیش آیا ہو یا ان سے قبل زیر بحث رہا ہو، جس کے لیے کوئی مرفوع متصل یا مرسل، یا موقوف حدیث ان کے پیش نظر نہ ہو، وہ صحیح ہو یا حسن، یا کم از کم لائق اعتبار ہو، حدیث نہ ملنے کی صورت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ یا دیگر خلفاء یا قضاۃ، یا فقہاء کا کوئی اثر تلاش کرتے یا کم از کم کوئی فقہی استنباط (عموم نص، یا اشارۃ النص کی روشنی میں) ہی ڈھونڈھتے، اس طرح اللہ نے ان کے لیے عمل بالسنۃ کو آسان کر دیا، اس طبقہ کے سب سے عظیم المرتبت، وسیع العلم، عالم حدیث، اور فقہی طور پر گہرے امام احمد بن حنبلؒ ہیں، ان کے بعد امام اسحٰق بن راہویہؒ کا درجہ ہے"۔

امام مالکؒ کی طرف میلان:

اس کے برخلاف مصفیٰ شرح مؤطا کا مقدمہ پڑھئے تو شاہ صاحبؒ امام مالکؒ کی طرف مائل نظر آتے ہیں، اس مقدمہ کی روشنی میں شاہ صاحبؒ کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ بغیر مؤطا کی کلید کے نہیں کھل سکتا، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: "میں اس میدان میں ایک طویل عرصہ تک حیران و پریشان رہا، اور راہِ اعتدال کا متلاشی رہا، اس کے لیے میں نے بہتوں سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی، پھر میں نے اللہ سے فریاد کی، کہ اے پروردگار! اگر آپ مجھے ہدایت نہ دیں گے تو میں گمراہ ہو جاؤں گا، میں پوری یکسوئی کے ساتھ خالق کائنات کی طرف متوجہ ہوا، تو اللہ نے بذریعۂ الہام میری رہنمائی امام ہمام، حجۃ الاسلام امام مالک بن انس کی شاہکار کتاب الموطأ کی طرف فرمائی، اور اس طرح میرے دل کو قرار حاصل ہوا، ....مؤطا کے مطالعہ کے بعد مجھے شرح صدر اور یقین ہو گیا کہ مؤطا روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح ترین کتاب ہے، اسی طرح مجھے یہ ایقان بھی

حاصل ہوا کہ آج کے دور میں فقہ واجتہاد کا راستہ صرف اسی شخص کے لیے کھل سکتا ہے، جو مؤطا کو اپنے پیش نظر رکھے، اور اس کے مراسیل اور صحابہ وتابعین کے اقوال کے مآخذ پر غور کرے، پھر الفاظ کے مفاہیم کی تعیین اور دلائل کی تطبیق وغیرہ فقہاء مجتہدین کا طریق اختیار کرے، نیز امام شافعی کے تعاقبات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرے، (ص:۱۷-۲۹/)

خود امام شافعی کے بارے میں بھی شاہ صاحبؒ کا خیال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مذہب کی بنا مؤطا پر رکھی ہے، ''الانصاف'' میں تحریر فرماتے ہیں:

فمن مادة مذهبه كتاب المؤطا وهو وان كان متقدما على الشافعي فان الشافعي بنى عليه مذهبه (ص:۲۵/)

ترجمہ: ان کے مذہب کے مادہ میں مؤطا شامل ہے، مؤطا اگرچہ امام شافعی سے پہلے لکھی گئی، مگر انہوں نے اپنے مذہب کی بنیاد اس پر رکھی''۔

زیادہ معتدل نقطۂ نظر:

اس لیے شاہ صاحبؒ کی کسی ایک تحریر کو بظاہر دیکھ کر ان کے مسلک کا فیصلہ کر دینا مناسب نہیں، شاہ صاحبؒ کی پوری علمی زندگی، ان کے تجدیدی افکار وخیالات اور ان کی تصنیفات کی مختلف عبارتوں کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ معتدل رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاہ صاحبؒ مذہب حنفی کے مقلد تھے، البتہ دیگر بہت سے ابواب کی طرح اس باب میں بھی آپ نے تجدیدی خدمات انجام دی ہیں، شاہ صاحبؒ کے عہد کے حالات پر نظر ڈالنے سے مذہب حنفی کے مقلدین کے یہاں جو علمی یا فکری بے اعتدالیاں محسوس ہوتی ہیں، ان کا تقاضا تھا کہ کوئی مجدد پیدا ہو، اور ان بے اعتدالیوں کو دور کرے، شاہ صاحبؒ اپنے دور کے بلاشبہ ایک عظیم مجدد تھے، انہوں نے زندگی کے تقریباً تمام ہی ضروری ابواب پر نظر ڈالی، اور اپنی قوت فکر اور عمل تجدید سے ان کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی، شاہ صاحبؒ کے دور میں جو جمود، تعصب، تنگ نظری، اور غالیانہ تصورات پیدا ہو گئے تھے، ان کی بنا پر دیگر

مذاہب کے مطالعہ وتحقیق بلکہ احترام کی روایت بھی اُٹھتی جارہی تھی، لوگ مذہب حنفی کے مقلد تھے، مگر اندھے مقلد، ان کوتقلیدی بصیرت، یابصیرت مندانہ تقلید حاصل نہ تھی، شاہ صاحبؒ نے اپنی کئی تحریرات اور پیغامات میں اس تعلق سے اپنے کرب کا اظہار کیا ہے، اور مذہب حنفی کے پیروکاروں کو مؤثر انداز میں متوجہ کیا ہے، شاہ صاحبؒ نے محسوس کیا کہ اس جمود اور تنگ نظری کا سبب مطالعہ وتحقیق اور وسعت نظری کی کمی ہے، اگر اہل علم تمام مذاہب فقہیہ کا منصفانہ مطالعہ کریں اور ان کے بنیادی مآخذ تک پہونچنے کی کوشش کریں، تو مذاہب کے درمیان اس درجہ تفریق وامتیاز کا جواحساس پایا جاتا ہے، اس میں کمی آئے، اور اسلاف باہم فکری ونظری اختلافات کے باوجود جس رواداری اور اکرام واحترام کا مظاہرہ فرماتے تھے، وہ روایت دوبارہ قائم ہو، شاہ صاحبؒ نے اسی بنیاد پر فقہ وحدیث کا تطبیقی اور دیگر مذاہب کا تقابلی مطالعہ شروع کیا، تاکہ ایک طرف فقہ حنفی کے بنیادی مآخذ تک لوگوں کی نگاہ پہونچے، اور علماء فقہی روایات کو قرآن، حدیث اور آثار کی روشنی میں بصیرت مندانہ طور پر سمجھنے کی کوشش کریں، دوسری طرف دیگر مذاہب کے بارے میں جو ذہنی بُعد پایا جاتا ہے، وہ دور ہو کہ یہ تمام مذاہب جب حق ہیں تو ان کے درمیان بیجا حساسیت مناسب نہیں۔

مذاہب کے مطالعہ کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ فقہاء کے اختلافات کی اصلیت سمجھنے میں علماء کو مدد ملے، اور یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکے کہ یہ اختلاف ہمارے آپس کے اختلاف جیسا نہیں تھا، بلکہ ان کا اختلاف علم اور اخلاص پر مبنی تھا، اور یہ تمام اکابر فروعی طور پر مختلف ہونے کے باجود بنیادی طور پر باہم متفق تھے۔

نیز اس سے اس تاریخی حقیقت کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے کہ بعد کے ادوار میں مذاہب اربعہ ہی کی تقلید کی خاص وجہ کیا ہوئی؟ اور ان کے ماسواء دیگر مذاہب کی تقلید کیوں جاری نہ رہ سکی؟ اس طرح شاہ صاحبؒ نے ایک بصیرت مند محقق کی طرح مذاہب فقہیہ پر نظر ڈالی، یہ شاہ صاحبؒ کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس کی مثال کم از کم اس دور میں نہیں ملتی،

شاہ صاحبؒ کا یہ کارنامہ بڑے دوررس اثرات کا حامل تھا، اگر شاہ صاحبؒ اتنے تعمق اور توسع سے کام نہ لیتے تو فقہی روایات واقوال کی شرعی حیثیت میں جس درجہ غلو برتا جارہا تھا، قدرتی طور پر کسی ردعمل کے نتیجے میں پورا فقہی ذخیرہ بحیثیت مذہب اور قانون رد کردیا جاتا، اس لیے کہ جن روایات واقوال کی اصلیت معلوم نہ ہو، اور قرآن وحدیث کے سرچشموں سے جو پوری طرح مربوط نہ ہوں تو محض ائمہ اور اسلاف کے نام پر ان کی روایتی عظمت بہت زیادہ دنوں تک باقی نہیں رکھی جاسکتی۔

شاہ صاحبؒ نے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ائمہ دراصل شارحین دین اسلام ہیں، اور ہم ان کی تقلید اسی حیثیت سے کرتے ہیں کہ یہ دین کی صحیح تشریح کرتے ہیں، ہم نہ ان کو صاحب شریعت یا صاحب وحی سمجھتے ہیں، اور نہ ان کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں کہ یہ معصوم ہیں، اور ان سے غلطی کا امکان نہیں، یہ وہ بنیادی فکری اصلاحات ہیں جن پر شاہ صاحبؒ نے پوری قوت کے ساتھ توجہ دی، اس کو بعض متعصب مقلدین نے عدم تقلید قرار دیا، کسی نے مذہب سے بغاوت یا خروج کا نام دیا، حالانکہ شاہ صاحبؒ کی ان اصلاحات سے مذہب حنفی کو بالخصوص اور دیگر مذاہب کے مقلدین کو بالعموم جو فائدہ پہونچا وہ بڑے بڑے نام نہاد مقلدین سے بھی نہیں پہونچا، شاہ صاحبؒ نے مذہب حنفی کی خدمت بصیرت کے ساتھ کی، جس کے بڑے دوررس نتائج سامنے آئے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی یہ تحریر بڑی بصیرت افروز اور مبنی برحقیقت ہے، لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے مجددانہ کارناموں میں ایک کارنامہ اور خدمت حدیث اور انتصار السنۃ ہی کے سلسلۂ زریں کی ایک اہم کڑی ان کی فقہ وحدیث میں تطبیق کی اور پھر مذاہب اربعہ میں جمع وتالیف کی کوشش تھی، اس سے اس بشارت نبوی کی تصدیق ہوتی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ ''تم سے خدا اس امت کی شیرازہ بندی کے ایک خاص نوع کا کام

لے گا.........

جہاں تک ہندوستان کے تحتی براعظم کا تعلق ہے اس میں اس طرز فکر اور جمع و تطبیق کی اس کوشش کا سراغ نہیں ملتا، اور اس کے تاریخی و علمی اسباب ہیں، یہ تحتی براعظم شروع سے ان فاتحین بانیان سلطنت کے زیر نگیں رہا، جو یا ترکی النسل تھے، یا افغانی النسل اور یہ دونوں قومیں تقریباً اپنے اسلام قبول کرنے کے زمانے سے مذہب حنفی کی حلقہ بگوش بلکہ اس کی حمایت اور نشر و اشاعت میں سرگرم اور پر جوش رہیں، یہاں اسلام کی تقریباً آٹھ سو سال کی تاریخ میں مذہب مالکی اور مذہب حنبلی کو تو قدم بھی رکھنے کا موقعہ نہیں ملا، شافعی مسلک سواحل تک محدود رہا، یا جنوبی ہند اور شمالی کنارے (موجود کرناٹک) کے بعض حصوں بھٹکل وغیرہ اور کیرالا میں محدود رہا، ان میں بھی مالابار (قدیم بلاد العنبر) کو مستثنیٰ کر کے جہاں زیادہ تر شافعی مسلک کے داعیان اسلام، تجار، مشائخ، اور فقیہ و عالم آئے، شیخ مخدوم فقیہ علی مہمائی (م ۸۳۵ھ) صاحب تفسیر تبصیر الرحمان اور تیسیر المنان، اور مالابار کے شیخ مخدوم اسماعیل فقیہ السکری الصدیقی (م ۹۴۹ھ) نیز مخدوم شیخ زین الدین طیباری (م ۹۲۸ھ) صاحب فتح المعین کے علاوہ ہمارے محدود علم میں اس پایہ کے شافعی فقیہ و محدث نہیں پیدا ہوئے ،........جو ہندوستان (بالخصوص شمالی ہند) کے علمی حلقوں پر گہرا اثر ڈالتے اور علماء حنفیہ کو فقہ شافعی پر عمیق نظر ڈالنے، اور اس سے استفادہ پر آمادہ کرتے، ہندوستان سے جو علماء اور طالبان علم حدیث و فقہ حجاز جاتے (جو ترکی سلطنت کے زیر انتظام تھا اور ترک ہر دور میں سو فیصدی سنی اور حنفی رہے ہیں) وہ بھی زیادہ تر اپنے ہی مذہب کے علماء اور خصوصیت کے ساتھ اپنے ہم وطن اساتذۂ فقہ و حدیث سے رابطہ رکھتے، جو وہاں ہندوستان یا افغانستان سے ہجرت کر کے چلے گئے تھے، اور ان کے شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا ،(مثلاً علامہ شیخ علی متقی برہان پوری، صاحب کنز العمال، علامہ قطب الدین نہروالی، ملا علی قاری ہروی مکی، شیخ عبدالوہاب متقی اور شیخ محمد حیاۃ سندی وغیرہ)

ان تمام اسباب کی بناپر شاہ صاحبؒ کو فقہ شافعی کے اصول وقواعد ،اس کی خصوصیات اور بعض مابہ الامتیاز چیزوں سے واقف ہونے کا پورا موقعہ ملا، اور اسی طرح فقہ مالکی اور فقہ حنبلی سے بھی باخبر ہونے کا وہ موقعہ ملا، جو علماء ہندوستان کو طویل عرصہ سے (تاریخی ،جغرافیائی ،سیاسی ،اور تمدنی اسباب کی بناپر) میسر نہیں آیا تھا،اور اس طرح مذاہب اربعہ کا تقابلی مطالعہ (الفقہ المقارن) ان کے لیے ممکن اور آسان ہوا، جو ان علماء کے لیے دشوار تھا،جن کو یہ مواقع حاصل نہیں ہوئے تھے۔(تاریخ دعوت وعزیمت :ج۵رص ۱۹۸-۲۰۰ر)

اس موضوع پر حضرت مولنا مناظر احسن گیلانیؒ نے ''تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہ'' میں بڑا مبصرانہ کلام فرمایا ہے، اور میرے خیال میں ان کے بعد کے اکثر انصاف پسند مصنفین نے اس سے استفادہ کیا ہے،مولانا گیلانیؒ نے عنوان قائم کیا ہے،''حضرت مجدد اعظم کی زندگی اور ان کے فکر ونظر کی تشریح وتوضیح'' اس عنوان کے تحت ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدیوں میں بعض خاص حالات خصوصا اسلام کے اصلی سرچشموں یعنی قرآن وحدیث کی تعلیم سے اسلامی مدارس جس حدتک بیگانے ہوتے چلے گئے ،بتدریج یہ اختلاف ،بہت غلط صورت اختیار کرتا چلا جاتا تھا،خصوصا ماوراء النہر (ترکستان وخراسان) کے حنفی فقہاء کا غلو اس باب میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا تھا، اور ہندوستان میں وطن بنانے کے لیے اسلام جس راستہ سے آیا چونکہ وہ انہی ممالک کا راستہ تھا، اس لیے قدرتا ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت اپنے ممالک کے علماء کی ذہنیت سے متاثر تھی''۔

پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا نادری اور ابدالی حملوں نے جب اس ملک میں روہیلوں کے جدید عنصر کا اضافہ کردیا،تو تشدد وتصلب کی یہ شرارت دوآتشہ ہوچکی تھی ....

شاہ صاحبؒ نے بڑی دانشمندی اور گہرے مطالعہ کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی بنیادوں سے پردہ ہٹایا، ائمہ مجتہدین اور ان کے اجتہادات کا جو صحیح مقام تھا، اسے واضح فرمایا،بعضوں کو تو شاہ صاحبؒ سے شکایت ہے کہ ہندوستان میں غیر مقلدین کی ابتداء آپ

ہی سے ہوئی، اور خود غیر مقلدوں کا طبقہ اس باب میں گونہ آپ کو اپنا پیشوا مانتا ہے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اگرامت یا کم از کم ہندی مسلمانوں کے ہاتھ میں اس وقت وہ معلومات نہ ہوتیں، جنہیں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عرق ریزیوں نے وقف عام کیا ہے، تو سرزمین نجد اور نجد سے آگے بڑھ کر حجاز میں جو تحریک وہابیت کے نام سے چل پڑی تھی اور یورپ والوں نے خاص اغراض کے تحت اس تحریک اور اس تحریک کے چلانے والوں کو مختلف طریقوں سے اچھالنا شروع کیا تھا''۔

واقعہ یہ ہے کہ غلامی کے ان دنوں میں جن میں ایسے کم ہیں جو اپنی زبان سے اپنی بات ادا کرتے ہوں، اور اپنے دماغ سے اپنے خیالات سوچتے ہوں، مشکل ہی سے غلام ہندوستان میں اس وقت کوئی حنفی نظر آتا، اس میں شک نہیں کہ اندرونی طور پر مغربی دجل وکید نے جو دام بچھایا تھا اور ذم کی صورتوں میں اس تحریک کی مدح کا جو گیت مختلف لہجوں میں گایا جاتا تھا، جس کا افسانہ طویل ہے اس میں کچھ ہمارے سادہ لوح ابتداء میں پھنس گئے، لیکن اہل علم کو معلوم ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے تحقیقی طرز عمل نے اس تحریک کو ہندوستان میں زیادہ پھیلنے نہیں دیا۔

''ولی اللہی'' مکتب فکر کے علماء کی کوششوں کا آج یہ نتیجہ ہے کہ ''شئی من صدر قلیل'' کے سوا اب عمل بالحدیث کے مدعیوں کی آبادیاں اپنے اندر اور کچھ نہیں رکھتیں۔

اس سلسلے میں حضرت کی کتابیں ''الانصاف'' عقد الجید'' حجۃ اللہ البالغۃ'' کے بعض ابواب، تفہیمات الہیہ'' کے بعض تفہیمات، ازالۃ الخفاء کی بعض ضمنی چیزیں، اور سب سے زیادہ موطا کی شرحوں نے حدیث فہمی کا جو معیار پیش کیا ہے، اور فقہ وحدیث میں تطبیق کی جو راہیں اشاروں میں شاہ صاحبؒ نے اہل فہم کے سامنے کھولی ہیں، سچی بات یہ ہے کہ آج حنفیت علی بصیرۃ من ربہ انہی بنیادوں پر قائم ہے۔

ایک بڑی دانشمندی شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمائی کہ حنفی فقہ کے ساتھ ساتھ آپ

نے درسی طور پر شافعی فقہ کے مطالعہ کو بھی ضروری قرار دیا، اپنے مسلک کی تشریح میں ایک موقعہ پر اپنے کو الشافعی درساً جو فرمایا ہے اس کا یہی مطلب ہے جو جانتے ہیں کہ فقہ حنفی اور فقہ مالکی کی حیثیت اسلامی قوانین کے سلسلے میں تعمیری فقہ کی ہے، اور شافعی و حنبلی فقہ کی زیادہ تر نوعیت ایک تنقیدی فقہ کی ہے، حنفیوں کی فقہ کو مشرق میں اور مالکیوں کی فقہ کو مغرب میں چونکہ عموماً حکومتوں کے دستور العمل کی حیثیت سے تقریباً ہزار سال سے زیادہ مدت تک استعمال کیا گیا، اس لیے قدرتاً ان دونوں مکاتب خیال کے علماء کی توجہ زیادہ تر جدید حوادث وجزئیات وتفریعات کے ادھیڑ بن میں مشغول رہی، بخلاف شوافع اور حنابلہ کے کہ بہ نسبت حکومت کے ان کا تعلق زیادہ تر تعلیم و تعلم، درس وتدریس اور تالیف وتصنیف سے رہا اس لیے عموماً تحقیق وتنقید کا وقت ان کو زیادہ ملتا رہا، بہر حال یہ افسانہ تو دراز ہے، مجھے کہنا یہ ہے کہ فقہ اور اسلامی قوانین کا تعلق ان کے سر چشموں یعنی کتاب وسنت سے ہے، جو چاہتے ہیں کہ یہ تعلق مسلسل زیادہ تر وتازہ حالت میں رہے، ان کے لیے شاہ صاحبؒ کا یہ طریقۂ عمل کہ شوافع اور حنابلہ کی فقہ اور ان کے ادبیات کا بھی مطالعہ جاری رکھیں، یہ بہت کچھ مفید ثابت ہوسکتا ہے، یا کم از کم حدیث کے درس میں خصوصیت کے ساتھ فقہاء امصار کے خلافیات اور ان کے وجوہ ودلائل کے بیان کرنے سے مسائل فقہ میں زندگی باقی رہتی ہے، ہر مذہب کا پیرو ان علل واسباب سے واقف رہتا ہے، جنکی روشنی میں اس کے امام نے اپنی رائے قائم فرمائی ہے، نیز چونکہ اس کے ساتھ دوسرے ائمہ مجتہدین کے دلائل ووجوہ بھی سامنے آتے رہتے ہیں، اسی لیے قدرتی طور پر جاہلی حمیت کا زہر ان میں پیدا نہیں ہونے پاتا، عقد الجید میں شاہ صاحبؒ نے ائمہ مجتہدین کے قیاسی نتائج کے متعلق بجائے اس نظریہ کے کہ حق ان میں سے ایک ہی ہوسکتا ہے، اس خیال کو جو ترجیح دی کہ سب ہی حق پر ہیں، تو فروعی اختلافات کی اہمیت کے سارے قصہ ہی کو ختم فرما دیا ہے، اس باب میں شاہ صاحبؒ کے مباحث قابل دید ہیں.........

تصوف کے متعلق بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے ہندوستان میں اس کے خلاف شاہ ولی اللہؒ ہی نے قلم بغاوت اٹھایا، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، آج جب کہ یورپ تحقیق وریسرچ کے نام سے اسلامی چیزوں کو غیروں کی طرف شاطرانہ چابک دستیوں سے منسوب کرنے میں منہمک ہے، اگر شاہ ولی اللہؒ کی تحقیقی کتابیں اس وقت ہمارے پاس نہ ہوتیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس دجالی ہنگامہ میں تصوف کا اسلام سے دور کا بھی رشتہ باقی رہ سکتا تھا؟ (تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ: ص ۲۳۱-۲۳۵ر)

فقہی میدان میں تجدیدی خدمات:

غرض شاہ صاحبؒ اپنے عہد کے مجدد اعظم تھے، اور انہوں نے علم وعمل کے بہت سے ابواب کی طرح فقہ اور اصحاب فقہ کو بھی اپنا ہدف تجدید بنایا، رہا یہ کہ فقہ پر غیر معمولی کام دائرۂ تجدید میں داخل ہوگا یا دائرۂ اجتہاد ہیں؟..............تو ظاہر ہے کہ جب تک انسان میں اجتہادی صلاحیت نہ ہو فقہ پر غیر معمولی عمل تجدید کر ہی نہیں سکتا، شاہ صاحبؒ جزوی طور پر بہت سے مسائل میں اجتہاد سے کام لیتے تھے، اور اللہ نے ان کو اس صلاحیت سے نوازا تھا، اور جس عہد میں وہ پیدا ہوئے تھے اس عہد میں ان کے سوا کوئی نہیں تھا، جو فقہ وحدیث پر اتنا عظیم الشان کام انجام دے سکے، بعض مرتبہ شاہ صاحبؒ کی طبیعت (ان کی بے پناہ صلاحیت کی بنا پر) تقلید سے اباء بھی کرتی تھی، لیکن اشارۂ غیبی ان کو تقلید پر مجبور کرتا تھا، اور اس عہد کا تقاضا ہی یہی تھا، کہ وہ مجتہد بن کر نہیں بلکہ مقلد بن کر کام کریں، اور جس شخص کو اجتہادی قوت رکھنے کے باوجود بحیثیت مجتہد کام نہ کرنے دیا جائے، بلکہ کسی مذہب کے دائرے میں رہ کر کام کرنے کی تاکید کی جائے، اس کی خدمات کو بلاشبہ تجدیدی خدمات ہی کہا جائے گا، نہ کہ اجتہادی خدمات۔

فقہی میدان میں تجدید کا تصور خود شاہ صاحبؒ کے یہاں بھی ملتا ہے، ''الانصاف'' میں مسلک حنبلی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلک حنبلی کی ابتدائی صدیوں میں مجتہدین

بکثرت پیدا ہوئے، بلکہ امام احمد کے اکثر اصحاب مجتہد مطلق کے مقام پر فائز تھے، اور ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جو تمام تر مجتہدات میں امام احمد کا مقلد ہو، بعد کی صدیوں میں ابن سریج پیدا ہوئے اور انھوں نے مسلک حنبلی کے مطابق تقلید وتخریج کے قواعد واصول مقرر کئے، پھر اکثر حنابلہ اسی راہ پر چل پڑے، ابن سریج کو ان کی غیر معمولی انقلابی خدمات کی بنا پر مجددین حنابلہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

حتیٰ نشأ ابن سریج فاسس قواعد التقلید و التخریج ثم جاء اصحابه یمشون فی سبیله و ینسجون علی منواله و لذلك یعد من المجدد ین علی راس المأئتین و الله اعلم (الانصاف:ص۲۴،مطبوعہ ترکی)

شاہ صاحبؒ فقہ حنفی کے مجدد:

اسی طرح شاہ صاحبؒ خود اپنی اصطلاح کے مطابق اپنے عہد میں فقہاء حنفیہ کے مجدد تھے، ان کی انقلابی خدمات نے حنفیہ کو جو فائدہ پہونچایا اور اس مذہب کے فقہاء اور علماء میں جو فقیہانہ بصیرت، دقت نظر اور وسعتِ مطالعہ پیدا ہوئی، اس کے پیش نظر شاہ صاحبؒ بجا طور پر فقہ حنفی کے مجدد تھے، شاہ صاحبؒ نے اپنی تحریرات میں کہیں تقلید سے خارج ہو کر کوئی بات نہیں کہی ہے، ان کے یہاں توسع ضرور ہے، مسلک حنفی کے بعض مسائل میں بصیرت مندانہ اختلاف بھی پایا جاتا ہے، مگر ایسا کہیں نہیں ہے، کہ وہ اپنی کسی تحقیق میں دائرہ تقلید ہی سے نکل گئے ہوں، اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کے قول کو قابل اعتناء نہ سمجھا ہو۔

شاہ صاحبؒ کو فقہ حنفی کی تقلید کا غیبی اشارہ:

شاہ صاحبؒ جس عبقری شان اور اجتہادی صلاحیت کے مالک تھے، اس کے پیش نظر ممکن تھا کہ وہ تقلید سے آزاد ہو کر کام کرتے، لیکن اشارۂ غیبی اور الہام ربانی نے ان کو اس سے باز رکھا۔

فیوض الحرمین میں شاہ صاحبؒ نے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی اس اندرونی

کشمکش کا اظہار کیا ہے، اور پھر اشارۂ غیبی کی روشنی میں وہ جس نتیجہ پر پہونچے اس کا ذکرہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

استفدت منه صلی اللّٰه علیه وسلم ثلثة امور خلاف ما کان عندی وما کانت طبعی تمیل الیه اشد میل فصارت هذه الاستفادة من براهین الحق تعالیٰ احدها الوصاة بترك الالتفات الی السبب وثانیها الوصاة بالت قلید بهذه المذاهب الاربع لااخرج منها والتوفیق مااستطعت وجبلتی تابی التقلید وتأنف منه رأسا ولکن شئی طلب منی التعبد به بخلاف نفسی وههنا نکتة طویت ذکرها وقدتفطنت بسرهذه الحیلة وهذه الوصاة (فیوض الحرمین)

ترجمہ: میں نے اپنے عندیہ اور اپنے شدید میلان طبع کے خلاف رسول ﷺ سے تین امور میں استفادہ کیا اور یہ استفادہ میرے لیے برہان حق بن گیا، ان میں سے ایک تو اس بات کی وصیت تھی کہ میں اسباب کی طرف سے توجہ ہٹالوں، اور دوسری وصیت یہ تھی کہ میں ان مذاہب اربعہ کا اپنے آپ کو پابند کروں اور ان سے نہ نکلوں اور تا بہ امکان تطبیق وتوفیق کروں، لیکن یہ ایسی چیز تھی جو میری طبیعت کے خلاف مجھ سے بطور تعبد طلب کی گئی تھی، اور یہاں ایک راز ہے جسے میں نے ذکر نہیں کیا ہے اور الحمدللہ مجھے اس حیلہ اور اس وصیت کا راز معلوم ہو گیا ہے۔

پھر جب مذاہب اربعہ کی تحقیق وتفتیش کے بعد ترجیح کا وقت آیا اور اس کی جستجو کے لیے آپ کی روح مضطرب ہوئی تو دربار رسالت سے اس طور پر رہنمائی کی گئی۔

عرفنی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان فی المذهب الحنفی طریقة انیقة هی اوفق الطرق بالسنة المعروفة التی جمعت ونقحت فی زمان البخاری واصحابه وذلك ان یؤخذ من اقوال الثلثة (ای الامام وصاحبیه) قول اقربهم بها فی المسئلة ثم بعد ذلك یتبع اختیار ات الفقهاء الحنفیین الذین کا نوا من علماء الحدیث فرب شئی سکت عنه الثلثة فی

الاصول ومايعرضوا نفيه ودلت الاحاديث عليه فليس بد من اثباته والكل مذهب حنفي (فیوض الحرمین: بحوالہ ظفر المحصلین ص۶۰-۶۱/)

ترجمہ: آنحضرت ﷺ نے مجھے بتایا کہ مذہب حنفی میں ایک ایسا عمدہ طریق ہے جو دوسرے طریقوں کی نسبت اس سنت مشہورہ کے زیادہ موافق ہے، جس کی تدوین اور تنقیح امام بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانے میں ہوئی اور وہ یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ یعنی امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد میں سے جس کا قول سنت معروفہ سے قریب تر ہو لے لیا جائے پھر اس کے بعد ان فقہاء حنفیہ کی پیروی کی جائے، جو فقیہ ہونے کے ساتھ حدیث کے بھی عالم تھے کیونکہ بہت سے ایسے مسائل ہیں کہ ائمہ ثلثہ نے اصول میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہا اور نفی بھی نہیں کی، لیکن احادیث سے ان کا ثبوت ہوتا ہے تو لازمی طور پر اس کو تسلیم کیا جائے گا، اور یہ سب مذہب حنفی ہی حصہ ہے"۔

خلاصۂ بحث یہ کہ شاہ صاحبؒ مسلکاً حنفی اور ماضی قریب میں حنفیہ کے مجدد تھے، اس لیے آپ کے کاموں کو مجددانہ حیثیت ہی سے دیکھا جانا چاہئے، ان کی تنقیدات بغاوت یا خروج عن التقلید پر نہیں بلکہ اصلاح وتجدید پر مبنی ہیں، انہوں نے جو کچھ کیا پورے اخلاص اور درد کے ساتھ کیا، اس میں نہ کسی انتقامی ردعمل کا دخل تھا اور نہ مجتہدانہ ادعاء کا، وہ بلاشبہ ایک مخلص، محقق اور بصیرت مند حنفی تھے،............اگر آپ حنفی نہ ہوتے تو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کے اثرات آپ کے صاحبزادوں پر پڑتے، مگر شاہ صاحبؒ کے تمام قابل فخر اور یکتائے روزگار صاحبزادے نہ صرف حنفی تھے بلکہ ان حضرات کی ساری زندگی اس مسلک کی خدمت وتحقیق میں گذری، بالخصوص آپ کے خلف اکبر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے حدیث اور فقہ وفتاویٰ کے میدان میں جو نہج اختیار کیا، اور جو کارنامے انجام دیئے وہ اہل علم سے مخفی نہیں، **فجزاهم الله منا احسن الجزاء**۔

۲

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعض فقہی نظریات اور مباحث

فقہی طور پر شاہ صاحبؒ کے مسلک ومقام کی تعیین کے بعد مناسب ہے کہ شاہ صاحبؒ کے بعض اہم فقہی نظریات وتحقیقات پر نظر ڈالی جائے، تاکہ آپ کی تجدیدی حیثیت کو سمجھنے میں مدد ملے، اور فقہ کے میدان میں آپ کے بعض مجددانہ کارناموں کی تفصیل سامنے آسکے۔

فقہ کا رشتہ اس کے اصل سرچشموں سے:

شاہ صاحبؒ نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس پر زور دیا کہ فقہ وفتاویٰ کو صرف چند کتابوں تک محدود کرنے کے بجائے ان کے اصل سرچشموں سے مربوط کیا جائے، اور عمومیت کے ساتھ یہ واضح کیا جائے کہ یہ علم قرآن وحدیث سے کس طرح اخذ کیا گیا؟

''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں شاہ صاحبؒ نے مستقل ایک مبحث قائم کیا ہے۔

''مبحث استنباط الشرائع من حديث النبی صلی اللہ علیہ وسلم''

یعنی احادیث سے مسائل شرعیہ کے استنباط کا طریقہ کیا ہے؟ اس مبحث کے تحت ایک باب قائم کیا ہے۔

''باب كيفية تلقی الامة الشرع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم''

یعنی امت نے اپنے نبیؐ سے علوم شرعیہ کی تحصیل کیسے کی؟ اس باب کے تحت شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے علوم شرعیہ کے حصول کے دو طریقے تھے۔

(۱) ایک طریقہ یہ ہے کہ الفاظ و واقعات کے ظواہر کو محفوظ کیا گیا اور اس کو آئندہ نسلوں تک پہونچایا گیا، پھر اس کی کئی صورتیں ہیں، متواتر، مشہور، اور خبر واحد وغیرہ جس کے لیے محدثین نے باقاعدہ اصول مقرر کیئے۔

(۲) دوسرا طریقہ معنوی تحصیل یا اجتہاد واستنباط کا ہے، صحابہ نے رسول ﷺ کو کوئی عمل کرتے ہوئے یا کوئی قول ارشاد فرماتے ہوئے دیکھا تو دلائل وقرآن سے یہ استنباط کیا کہ یہ چیز واجب ہے، جائز ہے، یا مستحب ہے، پھر یہ مسائل صحابہ سے تابعین تک اور ان سے تبع تابعین تک منتقل ہوئے۔ ....صحابہ کی اکثریت اس قوتِ اجتہاد واستنباط کی حامل تھی، مگر ان میں چار صحابہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ کو خاص امتیاز حاصل تھا، ان میں بھی حضرت عمرؓ سب سے ممتاز تھے، شاہ صاحبؒ کے خیال میں امت کے تمام مجتہدین کے مذاہب فقہی، فقہ فاروقی کے مقابلے میں وہی حیثیت رکھتے ہیں، جو ایک شرح کی متن کے مقابلے میں ہوتی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے ''فقہ فاروقی'' کو باقاعدہ ایک رسالہ کی شکل میں مدون کیا ہے، یہ اس باب میں پہلا مبارک اقدام تھا، جس کو شاہ صاحبؒ نے دوسری اولیات کے ساتھ انجام دیا، اس موضوع پر کوئی جامع منفرد کتاب اب تک مرتب نہیں ہوئی تھی، حال میں (۱۴۰۱ھ م ۱۹۸۱ء) ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی نے ''موسوعۃ فقہ عمر بن الخطاب'' کے نام سے ایک ضخیم مفصل کتاب مرتب کی جو مکتبۃ الفلاح کویت کی طرف سے شائع ہوئی ہے، یہ کتاب بڑے سائز کے ۶۸۷ رصفحات پر آئی ہے۔

حضرت عمرؓ کا طریقہ کار یہ تھا کہ پیش آمدہ مسائل پر اجتماعی طور پر غور وخوض فرماتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے فتاویٰ پوری مملکت اسلامیہ کے طول وعرض میں باتفاق رائے قبول کیئے گئے، حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے تھے، کہ حضرت فاروق کی وفات سے علم کے دس حصوں میں نو حصے رخصت ہو گئے، حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ

حضرت عمرؓ جوراہِ عمل انتخاب فرماتے وہ ہمیں سہل محسوس ہوتا تھا، دیگر صحابہ نے اپنے حالات اور مواقع کی بنا پر یہ طرز اختیار نہیں کیا، اس وجہ سے ان کے مسالک کی اشاعت محدود طور پر ہوئی۔

پھر تابعین نے ، بالخصوص مدینہ میں فقہاء سبعہ ، اور ان میں بھی حضرت سعید بن المسیبؒ ، مکہ میں حضرت عطاء بن ابی رباح، کوفہ میں حضرت ابراہیم نخعیؒ، حضرت شریح، اور حضرت شعبیؒ اور بصرہ میں حضرت حسن بصریؒ نے زیادہ نمایاں خدمات انجام دیں، اور اس طرح مسائل شرعیہ کا یہ علم طبقہ درطبقہ امت میں منتقل ہوتا رہا۔

دونوں طریقوں کا انضمام:

مگر حصول کے یہ دونوں طریقے جداگانہ حیثیت میں ناکافی ہیں، اور ان میں غلطی کا بہت امکان ہے، اس لیے کہ طریقۂ اول میں کمزوری یہ ہے کہ روایت بالمعنی کی صورت میں الفاظ کی تبدیلی سے معنی بدل جانے کا اندیشہ ہے، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص واقعہ کے حکم کو راوی نے حکم کلی سمجھ لیا ہو، نیز یہ بھی امکان ہے کہ کسی مصلحت سے کی جانے والی تاکید کو راوی وجوب یا حرمت سمجھ بیٹھا ہو، حالانکہ فی الواقع معاملہ ایسا نہ ہو، اس لیے ضروری ہے کہ راوی فقیہ اور صاحب اجتہاد ہو تاکہ معاملہ کو صحیح طور پر پرکھ سکے۔

اور دوسرے طریقے میں نقص یہ ہے کہ اس میں صحابہ کے قیاسات اور اجتہادات کا بڑا حصہ شامل ہے، جس میں غلطی کا بہرحال امکان ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حدیث ہی نہیں ملی، یا ایسے طریق سے ملی، کہ اس سے استدلال ممکن نہیں رہا اور اس بنیاد پر صحابی نے اجتہاد کو حکم کا مدار بنایا، اور اس کے بعد پھر کسی دوسرے صحابی سے صحیح اور واضح طور پر وہ روایت سامنے آگئی، مثلاً جنابت کے باب میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کا مسلک یہ نقل کیا جاتا ہے کہ تیمّم کافی نہیں ہے، ان تک روایت صحیح طور پر نہیں پہونچی اور انہوں نے اجتہاد کو مدار بنایا، حالانکہ صحیح روایت موجود ہے۔

غرض دونوں طریقوں میں جداگانہ طور پر غلطی کے امکانات موجود ہیں، اس لیے فقہ واجتہاد کے مسافر کے لیے محفوظ اورمعتدل راستہ یہ ہے کہ دونوں طریقوں سے ایک ساتھ استفادہ کیا جائے، اوردونوں کی روشنی میں اجتہاد واستنباط کیا جائے، تاکہ ایک کی کمزوری کی تلافی دوسرے سے ہوسکے، یہ ایک راہِ اعتدال ہے، جس کا حضرت شاہ صاحبؒ نے فقہ واجتہاد کے طلبہ اور علماء کو مشورہ دیا ہے۔

ولما كان الامر كذلك وجب على الخائض فى الفقه ان يكون متضلعا من كلا المشربين ومتبحرا فى كلا المذهبين وكان احسن شعائر الملة ما اجمع عليه جمهور الرواة وحملة العلم وتطابق فيه الطريقتان جميعا (حجۃ اللہ البالغۃ: ص۱۳۲؍)

۳

قرون اولیٰ میں اہل الحدیث اوراہل الرائے:

اس ضمن میں مناسب ہے کہ ان دو مکاتب فقہ کا تذکرہ کیا جائے، جو اسلام کے قرون اولیٰ میں اہل الحدیث اوراہل الرائے کے نام سے معروف تھے، اورحضرت شاہ صاحبؒ نے ''الانصاف'' میں اس پر بہت مفصل گفتگو کی ہے، شاہ صاحبؒ کے بیان کے مطابق یہ دونوں مکاتب فکر دراصل مذکورہ بالا دونوں طریقوں کی پیداوار ہیں، اہل حدیث نے پہلے طریقے کو اختیار کیا، اوراہل الرائے نے دوسرے طریق کو۔

یہ حضرت سعید بن المسیب، ابراہیم نخعیؒ، زہری، اوران کے بعد امام مالکؒ اور سفیان ثوریؒ کا دور ہے، یہ دونوں گروہ اسی دور میں وجود پذیر ہوگئے تھے۔

اہل حدیث کا طبقہ اجتہاد واستنباط اورقیاس ورائے کی بنیاد پرفتویٰ دینے سے حددرجہ گریز کرتا تھا، جب تک کہ سخت مجبوری نہ پیش آجائے وہ قیاس نہیں کرتا تھا، ان کی زیادہ تر توجہ احادیث وآثار پرہوتی تھی، اس لیے یہ حضرات مستقبل کی امکانی صورتوں کو

(جس کو فقہ تقدیری کہا جاتا ہے،) بھی زیر بحث لانا پسند نہیں کرتے تھے۔

ان کے پیش نظر کئی ایسے آثار تھے جن میں امکانی صورتوں کا حکم بتانے سے گریز کی تلقین کی گئی تھی، مثلاً حضرت معاذ بن جبلؓ کا قول ہے:

"یاایها الناس لاتعجلوا بالبلاء قبل نزوله فانه لاینفك المسلمون ان یکون فیهم من اذاسئل سدد (دارمی)

ترجمہ: اے لوگو! حوادث کے آنے سے پہلے ان کے بارے میں اظہار خیال نہ کرو اس لیے کہ مسلمانوں میں ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہیں گے جو ہر مشکل کا حل کریں گے۔

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ سے بھی اسی طرح کی بات منقول ہے۔

بعض ایسے آثار بھی موجود تھے، جن میں رائے کی بنیاد پر فتویٰ دینے سے احتیاط کی تاکید کی گئی تھی، مثلاً حضرت ابن عمرؓ نے حضرت جابر بن زیدؒ سے فرمایا:

اے جابرؒ تمہارا شمار فقہاء بصرہ میں ہوتا ہے، پس قرآن ناطق یا سنت معمولہ کے علاوہ کسی سے فتویٰ نہ دینا ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے، اور دوسرے کی ہلاکت کا بھی سامان کرو گے، (دارمی)

ابوالنضر فرماتے ہیں کہ: جب حضرت ابوسلمہؒ بصرہ تشریف لائے تو میں اور حسن بصریؒ ملاقات کے لیے حاضر ہوئے، حضرت ابوسلمہؒ نے حضرت حسنؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: آپ ہی حسن بصریؒ ہیں، میں بصرہ میں سب سے زیادہ آپ ہی سے ملنے کا مشتاق تھا، مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ اپنی رائے پر فتویٰ دیتے ہیں، اپنی رائے پر ہرگز فتویٰ نہ دیں، جب تک کہ رسول ﷺ سے کوئی سنت یا قرآن پاک کی کوئی آیت نہ مل جائے، فتویٰ نہ دیں۔ (دارمی)

ان آثار کی بنیاد پر اس طبقہ کی تمام تر توجہ احادیث و آثار کے جمع و تدوین پر لگ گئی، اور جس کے پاس احادیث و آثار کا جتنا بڑا ذخیرہ ہوتا وہ اتنا زیادہ تعلیم اور فتویٰ کے لائق مانا جاتا تھا۔

ایک ایک حدیث کے سو سو سے زائد طرق تھے ،اس طرح جرح وتعدیل اور اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان علم وجود میں آیا،جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی،ایک ایک آدمی لاکھوں احادیث کا حافظ ہوتا تھا،امام بخاریؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی صحیح بخاری چھ لاکھ احادیث کا انتخاب ہے،............امام ابوداؤد کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب پانچ لاکھ احادیث سے انتخاب کر کے تیار کی،........امام احمد نے اپنی مسند میں روایات کا اتنا بڑا ذخیرہ محفوظ کر دیا کہ کہا جاتا ہے کہ جو روایت اس میں نہ ملے، وہ بے اصل ہے،خود امام احمد اپنی اس کتاب کو میزان کہتے تھے..........اور اسی بنیاد پر جب حضرت امام احمد سے پوچھا گیا کہ کیا فتویٰ دینے کے لیے ایک لاکھ احادیث کافی ہیں؟ انہوں نے فرمایا نہیں،سائل اسی طرح اپنے سوالات میں احادیث کی تعداد بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ جب تعداد پانچ لاکھ تک پہونچ گئی تو فرمایا کہ ہاں! اب امید ہے کہ فتویٰ دے سکتا ہے۔(غایۃ المنتہی)

یہ فقہاء محدثین کا گروہ ہے،جس نے حدیث اور فقہ الحدیث کی مثالی خدمت انجام دی ہے،حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے نزدیک اس جماعت میں سب سے مشہور اور سب سے عظیم المرتبت شخصیت امام احمد بن حنبلؒ کی ہے،وہ اس گروہ کے سرخیل ہیں، اور سب سے زیادہ انہوں نے ہی اس طرز عمل کو فروغ دیا اور ان کا پورا مذہب فقہی اسی طرز عمل پر مبنی ہے،اسی لیے ان کے یہاں ایک ایک مسئلہ میں کئی کئی اقوال ملتے ہیں،اور یہ ان کے نزدیک کوئی عیب کی بات نہیں تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ اس مکتب فقہی سے بہت زیادہ متاثر ہیں،انہوں نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں متعارض روایات پر عمل کے لیے جو فیصلہ کن گفتگو کی ہے،وہاں اس کی صراحت کی ہے کہ اگر کسی چیز کے بارے میں دو طرح کی روایات منقول ہوں اور دونوں باہم متضاد نہ ہوں اور من قبیل عادت ہو تو دونوں کو مباح قرار دیا جائے گا،اور اگر من قبیل عبادت

ہوتو دونوں کو مستحب یا دونوں کو واجب قرار دیا جائے گا، یعنی دونوں صورتوں میں سے کسی پر عمل کرلیا جائے تو مستحب یا واجب ادا ہو جائے گا۔

حکیٰ صحابی انه صلی اللّٰہ علیه وسلم فعل شیئا وحکیٰ آخر انه فعل شیئا آخر فلا تعارض ویکونان مباحین ان کانا من باب العادۃ دون العبادۃ.........اویکونان جمیعاً مستحبین اوواجبین یکفی احدهما کفایة الآخر ان کانا جمیعا من باب القربة وقدنص حفاظ الصحابة علی مثله فی کثیر من السنن (ص:۱۳۸، باب القضاء فی الاحادیث المختلفۃ)

شاہ صاحبؒ نے اس مکتب فقہی کے حاملین میں امام احمدؒ کے علاوہ حضرت یزید بن ہارونؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، امام اسحٰقؒ اور بعد کے ادوار میں امام بخاریؒ، مسلمؒ، ابوداؤدؒ، عبد بن حمیدؒ، دارمی، ابن ماجہ، ابو یعلیٰ، ترمذی، نسائی، دارقطنی، حاکم، بیہقی، خطیب، دیلمی، اور ابن عبد البر کے اسماء گرامی شمار کرائے ہیں، ان میں بھی امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ، اور مام ترمذیؒ کو خصوصی اہمیت دی ہے، شاہ صاحبؒ کے نزدیک ان ائمہ کی کتابیں اسی طرز فکر پر مرتب کی گئی ہیں جو اس طرز فکر کے مجتہد کے لیے کافی ہیں۔

(الانصاف ص۴۶-۵۶)

اس کے بالمقابل دوسرا گروہ اہل رائے، کے نام سے مشہور تھا، جو فقہ وفتاویٰ کے باب میں اجتہاد واستنباط سے زیادہ روایت حدیث کے معاملے میں محتاط اور حساس تھا، ان کا خیال یہ تھا کہ کسی مسئلے کی نسبت رسول ﷺ کی طرف کرنے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، اس لیے کہ احادیث میں اس پر تنبیہ کی گئی ہے اس سے آسان اور محتاط صورت یہ ہے کہ حکم کی نسبت دوسرے فقہاء مجتہدین کی طرف کی جائے، تا کہ اگر بیان حکم میں کوئی کمی بیشی ہو تو اس کی نسبت ذات رسالت مآب کی طرف نہ ہو۔

حضرت امام شعبیؒ کہتے تھے، کہ:

علی من دون النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم احب الینا فان کان فیه زیادة او نقصان کان علی من دون النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم

یعنی غیر نبی کی طرف نسبت کرنا ہمیں زیادہ پسند ہے، اس لیے کہ اس میں کوئی کمی یا بیشی ہوگی تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہوگی"۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے تھے کہ:

اقول: قال عبد اللّٰہ وقال علقمة احب الی"

کہ میں کسی حکم کے بارے میں یہ کہنا زیادہ پسند کرتا ہوں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یا حضرت علقمہ نے فرمایا ہے"۔

اسی لیے بہت ایسا ہوتا تھا کہ کوئی حکم نبی ﷺ سے منقول ہوتا تھا، مگر بطور احتیاط بعض صحابہ اور تابعین اس کی نسبت حضورؐ کی طرف کرنے کے بجائے اپنے فتویٰ کے طور پر اس کو بیان فرماتے تھے، جس سے بعض لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ یہ ان کا فتویٰ ہے، حالانکہ وہ قولِ رسول ہوتا تھا، اور محض احتیاط کی بنا پر وہ حضور کی طرف انتساب نہیں کرتے تھے، اس فکر کی بنیاد دراصل اس روایت پر تھی جس میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعده من النار ..... رواہ البخاری

(مشکوٰۃ: کتاب العلم: ص۳۲)

اور اس فکر کی جڑیں عہد صحابہ میں کافی حد تک مضبوط تھیں، بالخصوص عہد فاروقی تک نقل وروایت کے باب میں صحابہ حد درجہ محتاط تھے......... حضرت عمر فاروقؓ نے انصار کی ایک جماعت کوفہ روانہ فرمائی تو ان کو نصیحت فرمائی کہ آپ حضرات کوفہ تشریف لے جا رہے ہیں، آپ وہاں ایسے لوگوں سے ملیں گے، جن کے گھر اور سینے قرآن کی گونج سے آباد ہوں گے وہ آپ کے پاس یہ کہتے ہوئے دوڑے آئیں گے کہ رسول اللہ کے اصحاب تشریف لائے ہیں" رسول اللہ کے اصحاب تشریف لائے ہیں' وہ آپ لوگوں سے حضورؐ کی

احادیث کے بارے میں پوچھیں گے، ایسے نازک موقعہ پر آپ حضرات روایت کے باب میں زیادہ سے زیادہ محتاط رہیں۔ (دارمی)

حضرت ابن مسعودؓ کا حال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے کوئی بات بتانے لگتے تو چہرے کا رنگ اڑ جاتا، (دارمی)

ایک طرف نقل وروایت کے باب میں یہ احتیاط ان کو ملحوظ تھی، دوسری طرف ان کے پیش نظر وہ روایات اور آثار تھے جن میں کوئی مسئلہ منصوص نہ ملنے کی صورت میں انفرادی یا اجتماعی طور پر اجتہاد بالرائے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ جب یمن کے گورنر بنا کر بھیجے جارہے تھے تو حضورؐ کے دریافت کرنے پر جب آخر میں انہوں نے یہ فرمایا کہ: ''اجتهد برائی ولا آلو'' پیش آمدہ مسائل قرآن اور سنت میں نہ ملے گا تو اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اور اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا، تو حضورؐ نے ان کی تصویب فرمائی اور ان کی اس توفیق حق پر اللہ کا شکر ادا فرمایا۔ (مشکوٰۃ شریف)

حضرت میمون بن مہرانؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو پہلے ''کتاب اللہ'' میں دیکھتے، اگر وہاں مسئلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے، اور اگر نہ ملتا تو سنت رسولؐ میں غور فرماتے، اگر وہاں بھی نہ ملتا تو صحابہ سے دریافت فرماتے کہ میرے پاس ایسا مسئلہ آیا ہے کیا آپ میں سے کسی کے علم میں حضور ﷺ کا کوئی قول یا علم ہے؟ ایسے مواقع پر کبھی بہت سے لوگ جمع ہوجاتے اور کئی لوگ بیان کرنے لگتے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے معاملے میں یہ فیصلہ فرمایا ہے تو حضرت ابوبکرؓ خوش ہوجاتے اور فرماتے کہ اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ہمارے اندر علوم نبوت کے محافظین پیدا فرمائے، اور اگر سنت سے بالکل رہنمائی نہ ملتی تو ارباب علم کو جمع فرما کر مشورہ کرتے اور اجتماعی غور وفکر سے جو طے ہوجاتا اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے، (الانصاف: ص ۵۱)

قاضی شریح فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ان کو لکھا کہ اگر تمہارے پاس کوئی ایسا مسئلہ آجائے جو کتاب اللہ اور سنت رسولؐ میں منصوص نہ ہو اور نہ تم سے پہلے کے فقہاء کا کوئی قول اس کے بارے میں منقول ہو تو دو چیزوں میں سے جس کو چاہو اختیار کرو، چاہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو اور اسی طرح کرتے رہو، اور چاہو تو رائے سے اجتناب کرو اور اسی احتیاط پر قائم رہو، اور میں تمہارے لیے احتیاط ہی میں خیر سمجھتا ہوں،

(الانصاف: ص ۵۱)

حضرت ابن عباسؓ سے جب کوئی استفتاء کیا جاتا اور وہ مسئلہ قرآن میں مل جاتا تو قرآن سے جواب دیتے ورنہ حدیث سے جواب دینے کی کوشش کرتے، اگر حدیث میں بھی نہ ملتا تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فیصلوں سے رہنمائی لیتے، اور اگر ان سے بھی رہنمائی نہ ملتی تو اپنی رائے سے اجتہاد فرماتے، (الانصاف: ص ۵۲)

چنانچہ اہل رائے کے طبقہ نے اجتہاد و استنباط پر پورا زور دیا، اس کے لیے باقاعدہ اصول وضوابط مقرر کئے، تخریج و تنقیح کے قواعد متعین کئے، اور روایت سے زیادہ فقاہت روایت کو بنیاد بنایا، شاہ صاحبؒ نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول اسی پر منظر میں نقل کیا ہے، انہوں نے حضرت امام اوزاعی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

ابراهيم افقه من سالم ولولا فضل الصحبة لقلت علقمة افقه من ابن عمرؓ (الانصاف: ص ۵۸/)

ترجمہ: ابراہیم نخعیؒ سالم کے مقابلے میں زیادہ فقیہ ہیں اور اگر شرف صحبت حاصل نہ ہوتا تو میں کہتا کہ حضرت ابن عمرؓ کے مقابلے میں حضرت علقمہؒ کا تفقہ زیادہ مضبوط ہے۔

(حالانکہ امام ابوحنیفہؒ نے یہ بات ترجیحی اصول کے طور پر کہی تھی جیسا کہ اس قول کے پس منظر سے واضح ہوتا ہے ان کی منشاء ہرگز یہ نہیں تھی کہ روایت کے مقابلے میں کسی کا اجتہاد زیادہ اہمیت رکھتا ہے، معاذ اللہ)

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے واقعات کی بڑی تلخ ترجمانی کی ہے اور ائمہ مجتہدین کے تلامذہ نے ان کے مجتہدات کو محفوظ اور مدون کرنے کے سلسلے میں جو مساعی جمیلہ انجام دیں ان کا تذکرہ کیا ہے، .... حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس طبقہ کے نزدیک چونکہ اجتہاد و تخریج کو مرکزی اہمیت حاصل تھی اس لیے ان کے تلامذہ اور منتسبین نے اپنی جدوجہد کو اسی رخ پر مرکوز کیا اور روایات و آثار سے زیادہ فقہی مجتہدات اور ائمہ کے اقوال کے حفظ و تدوین، ان سے قواعد و اصول کے استنباط و استخراج، مسائل کے درجات کی تعیین، طبقات فقہاء اور طبقات کتب کی تحدید پر پورا زور صرف کیا، شاہ صاحبؒ نے اس دور کی جو تصویر کشی کی ہے، اس میں شاہ صاحبؒ نے ''اہل الرائے'' کا جو مفہوم بیان کیا ہے، یا جن لوگوں پر اس اصطلاح کا اطلاق کیا ہے وہ بھی محل نظر ہے، .... مگر اس حد تک بہر حال درست ہے کہ اس دور میں علماء کا ایک (مختصر) طبقہ ایسا ضرور موجود تھا جو روایات سے زیادہ درایت اور اجتہاد کے اصول پر قائم تھا۔

راہِ اعتدال:

اسی طرح ان دونوں طبقات کے تذکرے کے بعد شاہ صاحبؒ نے جو راہِ عمل پیش کی ہے، وہ انتہائی معتدل اور مبنی بر انصاف ہے، ...... شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''کلام فقہاء پر تخریج اور الفاظ احادیث کا تتبع دین میں دونوں کی مستحکم اصل موجود ہے، اور ہر زمانہ کے علماء محققین ان دونوں اصولوں پر عمل کرتے رہے ہیں، بعض ایسے ہیں جن کا تخریج میں قدم پیچھے ہے، اور الفاظ حدیث کے تتبع میں آگے، اور بعض اس کے برعکس ہیں، ان میں سے کسی ایک اصول سے بھی مطلقاً صرف نظر مناسب نہیں، جیسا کہ فریقین کے عوام کا شیوہ ہے، اس بارے میں صراط مستقیم یہی ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی جائے، اور ایک کی کمی دوسرے سے پوری کی جائے، اس محتاط اور حکیمانہ نکتہ کی طرف امام حسن بصریؒ ہماری رہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

سنتکم واللّٰہ الذی لاالہ الاھو.....بینھما بین الغالی والجافی

یعنی اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تمہارا راستہ حد سے بڑھنے والے اور حد تک نہ پہونچنے والے دونوں کے بیچ میں ہے''۔

یعنی حق کا مرکز افراط وتفریط کے بیچ میں ہے، جوارباب حدیث ہیں انہیں چاہئے کہ اپنے اختیار کردہ مسلک کو مجتہدین سلف کی آراء پر پیش کریں اسی طرح جو اہل تخریج ہیں اور مجتہدین کے اصول پر مسائل کا استنباط کرتے ہیں انہیں بھی چاہئے کہ حتی الوسع صحیح اور صریح نصوص کو اپنے اصول اور رائے پر قربان نہ کریں، اور نہ ایسا طریقہ اختیار کریں کہ فرمودۂ نبوی کی صریح مخالفت کا انہیں بار اٹھانا پڑے۔

کسی محدث کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ ان اصول حدیث کے اتباع میں بے جا تعمق اور توغل سے کام لے، جنہیں پرانے محدثین نے وضع کیا ہے، کیونکہ بہرحال وہ بھی انسان ہی تھے، اور شارع کی طرف سے ان کی صحت اور قطعیت پر کوئی سند نہیں پیش کی جاسکتی ہے، اور اس اصول پرستی کے تشدد میں حدیث یا قیاس صحیح کو رد نہ کرے، مثلاً انقطاع یا ارسال کے ایک ذرا سے شک کی بنا پر کتنی ہی حدیثیں متروک اور ناقابل استناد ٹھہرادی جاتی ہیں، حالانکہ فی نفسہ وہ قول رسولؐ ہوا کرتی ہیں، جیسا کہ ابن حزم نے اس طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے تحریم معازف (باجوں کے حرام قرار دینے) والی حدیث کو ناقابل حجت قرار دے دیا، صرف اس وجہ سے کہ امام بخاری کی روایت میں انقطاع کا شبہ پایا جاتا ہے، حالانکہ حدیث فی نفسہ صحیح اور سلسلۂ سند متصل ہے، اور اس طرح کی روایت تعارض کے وقت قابل استدلال ہوتی ہے۔ (الانصاف: ص۶۲ر)

روایت اور درایت کے بارے میں معتدل نقطۂ نظر:

شاہ صاحبؒ نے ارباب حدیث کی ایک اور اصولی کوتاہی کی نشاندہی کی ہے، فرماتے ہیں:

''ارباب حدیث کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی محدث کی روایتوں کو عموما زیادہ صحت کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے، اور دوسرا ظاہری صحت کی حفاظت سے اتنا اعتنا نہیں کرتا، تو کلیۃً پہلے شخص کی ہر روایت (جو اس محدث سے کی گئی ہو) دوسرے راوی کی روایت پر مقدم اور راجح مانی جاتی ہے، خواہ اس دوسری راوی کے اندر ترجیح کے کتنے ہی اسباب و دواعی موجود ہیں''۔

متن احادیث کے بارے میں صحیح مسلک یہی ہونا چاہئے کہ راوی جو کچھ بھی اپنی زبان سے کہے اسے کلام نبوی ؐ کی حیثیت سے مان لیا جائے، ہاں اگر کوئی اور قوی حدیث یا شرعی دلیل اس کے خلاف مل جائے، تو مقدم الذکر کو ترک کر کے اسے اختیار کرنا ضروری ہے۔

ایسی ہی ذمہ داری اور احتیاط ان فقہاء پر بھی عائد ہوتی ہے، جو ائمہ مجتہدین کے اصول اور فتاویٰ کو سامنے رکھ کر مسائل کا استخراج کرتے ہیں، ان کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ کرید کرید کر ایسے اقوال نکالیں جن سے نہ تو خود ان کے ائمہ کے اصول اور تصریحات سے کوئی دور کا تعلق ہو، نہ علماء لغت ان میں وہ معانی سمجھ سکیں، اور نہ عرف عام میں ایسا طریقۂ سخن فہمی رائج ہو، بلکہ محض اپنے ذہن سے ایک علت متعین کر لی جائے، یا ایک ادنی مشابہت تلاش کر لی جائے، اور اسے قول مجتہد مان کر صدہا مسائل میں اس خود آفریدہ علت یا مشابہت کو معیار حکم ٹھہرا لیا جائے، حالانکہ اگر وہ امام جس کے قول سے یہ تصریحات کی گئی ہیں، آج زندہ ہو کر آجائے اور یہ مسائل براہ راست اس سے پوچھے جائیں تو وہ اس طرح کی تدقیقات و تخریجات کا انکار کر دے۔

تخریج کا یہ طریقہ نہایت غیر ذمہ دارانہ ہے، تخریج تو محض اس وجہ سے جائز ہے کہ وہ درحقیقت مجتہد کی تقلید اور پیروی ہے، اور اس کا تحقق وہیں تک ممکن ہے جہاں تک امام کے اقوال عام اصول فہم و تدبر کے مطابق اجازت دیں۔

اس کے علاوہ ان فقہاء کو اس کا لحاظ بھی رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے اصول کی پیروی کے

جوش میں ان مستند احادیث یا آثار کو رد نہ کریں، جنہیں محدثین میں مقبولیت حاصل ہو چکی ہے، (الانصاف :ص ۵۷-۶۳ر)

اصولی طور پر شاہ صاحبؒ کی یہ فکر انتہائی معتدل اور دور رس نتائج کی حامل ہے، شاہ صاحبؒ کی ان تنبیہات کا امت نے بڑا خوشگوار اثر قبول کیا، بیداری پیدا ہوئی، اور امت کے مختلف طبقات نے ان کے زیر اثر اپنے فکر و عمل میں اعتدال لانے کی کوشش کی۔

اور حقیقت یہ کہ شاہ صاحبؒ کی یہ تنبیہات علامہ ابوسلیمان الخطابی کی کتاب ''معالم السنن'' سے مستفاد ہیں، جس کا حضرت شاہ صاحبؒ نے الانصاف میں حوالہ دیا ہے، اور ایک طویل اقتباس بھی نقل کیا ہے، (الانصاف :ص ۶۴-۶۷ر)

البتہ خطابی کے کلام میں وہ زور استدلال اور معقولیت نہیں ہے جو شاہ صاحبؒ کے یہاں ہے اسی طرح خطابی کے کلام میں لب ولہجہ کی ناگواریت کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہے، جب کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں کافی حد تک توازن موجود ہے۔

تنقیدی مطالعہ کی ضرورت:

کافی حد تک کی قید اس بنا پر ہے کہ ادوار فقہی کی تصویر کشی میں شاہ صاحبؒ کے یہاں بھی مکمل توازن قائم نہیں رہ سکا ہے، اسی طرح بعض اصولی باتوں کی شاہ صاحبؒ نے جو مثالیں دی ہیں وہ پوری طرح منطبق نہیں ہیں، مثلاً اسی آخری ٹکڑے میں اس اصولی گفتگو کے ذیل میں کہ محض اصول متخرج کی بنا پر مقبول اور صحیح روایات کو رد نہیں کرنا چاہئے، (اس اصول سے فقہاء حنفیہ کو بھی اختلاف نہیں ہے، بلکہ ان کے اصول متخرجہ کی بنیاد میں اس کا لحاظ شامل ہے) اس کی ایک مثال حضرت شاہ صاحبؒ نے حدیث ''مصراۃ'' پیش کی ہے، اس پر کافی گفتگو کی جاسکتی ہے، کہ فقہاء حنفیہ نے حدیث مصراۃ کو محض اپنے اصولوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ بعض قرآنی نصوص اور اسلام کے عام اصول مکافات کی بنا پر چھوڑا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے، العرف الشذی اور اعلاء السنن)

اسی طرح کا عدم توازن شاہ صاحبؒ کے یہاں فقہ واجتہاد کے مباحث میں بھی کئی جگہ کھٹکتا ہے، اور اصولی طور پر نتیجۂ بحث سے اتفاق کے باوجود تمثیلی یا تصویری اعتبار سے شاہ صاحبؒ سے اتفاق بہت مشکل نظر آتا ہے، ہوسکتا ہے یہ میرے فکر ونظر اور علم ومطالعہ کی نارسائی ہو لیکن ارباب نظر کو اس جانب توجہ دلاتے ہوئے اس قدر کہنے کی جسارت کروں گا، کہ فقہ واجتہاد کے باب میں شاہ صاحبؒ کے کلام کا تنقیدی مطالعہ بھی ضرور ہونا چاہئے۔

۴

اجتہاد .... مفہوم اور مراتب

شاہ صاحبؒ کے یہاں اہم ترین بحث اجتہاد کے مفہوم، مراتب اور دائرہ کار کی بھی ہے، شاہ صاحبؒ نے الانصاف اور عقد الجید میں اجتہاد کے مفہوم اور مراتب اور اس کے طریقۂ حصول پر کافی مفصل بحث کی ہے، مثلاً:

اجتہاد کا مفہوم یہ ہے کہ انسان تتبع نصوص وآثار اور اصول وقواعد کی تخریج واستحضار کے ذریعہ ایسی معرفت اور صلاحیت حاصل کر لے کہ وہ زیادہ تر مسائل وواقعات کا جواب دے سکے، اور اس کے جوابات کا بیشتر حصہ واضح اور صریح وصحیح ہو، (الانصاف :ص ۱۰۲ر)

عقد الجید میں مجتہد کی تعریف یہ کی گئی ہے:

''مجتہد وہ شخص ہے جو قرآن، حدیث، مذاہب، سلف، لغت، قیاس ان پانچ چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو یعنی مسائل شرعیہ کے متعلق جس قدر قرآن میں آیتیں ہیں جو حدیثیں رسول اللہؐ سے ثابت ہیں، جس قدر علم لغت درکار ہے، سلف کے جو اقوال ہیں، قیاس کے جو طرق ہیں، تقریباً سب کا علم ہو، اگر ان میں سے کسی میں کمی ہے تو وہ مجتہد نہیں، اور اس کو تقلید کرنی چاہئے۔ (عقد الجید فی مبحث الاجتہاد :ص ۷)

مجتہد کا دائرہ عمل:

مجتہد کے فرائض کیا ہیں؟ اور اس کا دائرہ عمل کیا ہے؟ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس پر مصفیٰ شرح مؤطا میں کافی تفصیلی اور عمدہ کلام کیا ہے، اس کے بعض اہم حصے پیش خدمت ہیں۔

(۱) مشتبہ الفاظ کی وضاحت کرنا..........اس ضمن میں چار چیزیں آتی ہیں۔

تقسیم........مثال........اصلی مطلوبہ معنی کی تعیین........اور دلائل شرعیہ کی جستجو

۱ؔ تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ شئی مطلوب کا وہ عام حصہ لیا جائے، جس کے عموم میں خود یہ بھی شامل ہو اور اس کے دیگر تمام افراد بھی، پھر اس ضمن میں داخل تمام اشیاء کا موازنہ کیا جائے، اور شئی مطلوب اور اس کے دیگر نظائر کے درمیان وجوہ فرق کو محسوس کیا جائے، اور ان کے درمیان ایسے حدود و قیود مقرر کیے جائیں کہ مفہوم عام اصطلاح منطق میں بمنزلہ جنس ہو جائے، اور دیگر قیودات بمنزلہ فصل، مثلاً سفر یا وطن سے خروج، عام معنی کے لحاظ سے اس کا اطلاق تفریح کے لیے سیر گلشن پر بھی ہوتا ہے، اور بلا مقصد ادھر ادھر مارے مارے پھرنے پر بھی اور با مقصد طور پر کسی خاص منزل کی طرف سفر پر بھی، لیکن غور کیا جائے تو ان کے درمیان کافی فرق ہے، سفر شرعی، اور سفر تفریحی کے درمیان فرق یہ ہے کہ سفر تفریح میں منازل قریب اور واپسی آسان ہوتی ہے، جب کہ سفر شرعی میں یہ بات نہیں ہوتی، اسی طرح سفر شرعی اور بے مقصد مارے مارے پھرنے میں بھی فرق ظاہر ہے کہ ایک با مقصد ہے اور دوسرا بے مقصد۔

۲ؔ مثال کا مطلب ہے حتی الوسع ان تمام جزئیات کا استحضار جن پر اس کلمہ کا لغوی طور پر اطلاق ممکن ہو، مثلاً سفر کا اطلاق کہاں سے کہاں تک پر ہو سکتا ہے، جدہ سے مکہ تک ،عفان سے مکہ تک، مکہ سے مدینہ تک، حیدرآباد سے پٹنہ تک وغیرہ۔

۳ؔ اصل مطلوبہ معنی کی تعیین کا مطلب یہ ہے کہ شئی کے تمام وجودی اور عقلی لوازم پر ذہنی وجدان سے غور کیا جائے اور پھر اس کے تمام اطلاقات کو ذہن میں رکھتے ہوئے مقررہ معیار پر پرکھا جائے، کہ اصل مطلوبہ حصہ کیا ہے؟ مثلاً ''خف'' پاؤں کا لباس ہے، مگر یہ کپڑے کا نہیں بلکہ چمڑے کا لباس ہے، یہ ٹخنے تک بھی ہو سکتا ہے، اور ٹخنے سے اوپر گھٹنے تک بھی، مگر ٹخنے سے اوپر ہو یا نہ ہو اصل حکم شرعی پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ مطلوب صرف اس قدر ہے کہ محل فرض پر خف ہے، یا نہیں، قطع نظر اس سے کہ زیادہ ہے یا

نہیں؟

۴ دلائل شرعیہ کے تتبع کا مفہوم یہ ہے کہ متعلقہ تمام دلائل پر اس طرح غور کیا جائے کہ کن قیودات کی موجودگی میں حکم شرعی پایا جاتا ہے، اور کن کی موجودگی میں نہیں، اس طرح تمام دلائل (نصوص وآثار) سامنے رکھ کر مجتہد کوئی ایسا جامع مانع اصول یا تعریف دریافت کرسکتا ہے، جس کے مطابق حکم شرعی کا اطلاق کیا جا سکے، مثلاً حج تمتع کی تعریف کیا ہے؟ اور اس کا اطلاق کس حج پر ہوگا؟ اس سلسلے میں اگر متعلقہ دلائل شرعیہ کو جمع کیا جائے تو حج تمتع کی حقیقت سمجھی جاسکتی ہے، ایک آیت کریمہ ہے:

فمن تمتع بالعمرة الی الحج (بقرة:۱۸۶)

بس جو عمرہ کو حج کے ساتھ کرنے کا فائدہ اٹھائے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے، حج تمتع نام ہے حج اور عمرہ کو اشہر حج میں جمع کرنے کا۔

اور آیت کریمہ کا دوسرا ٹکڑا ہے:

ذلك لمن لم یكن اهله حاضری المسجد الحرام (بقرة:۱۹۶)

ترجمہ: یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو مسجد حرام کا حاضر باش نہ ہو۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف آفاقی کے لیے ہے، مکی کے لیے نہیں۔

اس طرح دونوں آیتوں میں غور کرنے سے ثابت ہوا کہ حج تمتع یہ ہے کہ کوئی آفاقی شخص اشہر حج میں حج اور عمرہ دونوں ادا کرے۔

(۲) ہر شئی کے ارکان، شرائط اور آداب کی تعیین کرنا، اس کی بنیاد بھی نصوص اور شرعی اشارات کے تتبع اور ان مقامات کے استقراء پر ہے جہاں شریعت نے اس کا ذکر کیا ہو، اسی طرح ضروری ہے کہ متعلقہ مسئلہ کے تمام اجزاء اور شرائط کی تفتیش کی جائے، اسی طرح ذہن میں حاصل شدہ مفہوم میں سے کون سا حصہ شرعی ہے، اور کون سا عادی، اس کو دلائل اور قرائن سے ثابت کیا جائے۔

(۳) صیغۂ امر سے وجوب مراد ہے یا استحباب ،اورصیغۂ نہی سے حرمت مراد ہے یا کراہیت اس کی تعیین۔

(۴) دلائل کے ساتھ علت حکم کی معرفت،اسی طرح علت کے مطابق حکم کے اطلاق وتقیید کی معرفت بھی ضروری ہے۔

احکام میں علت کی بڑی اہمیت ہے،اس لیے کہ قانون اسلامی ایک آفاقی اوردائمی قانون ہے،اور یہ ممکن نہیں تھا کہ قیامت تک آنے والے مسائل وجزئیات کی تصریح قرآن وحدیث کے صفحات میں کردی جاتی ، اسی لیے شریعت نے احکام کے ساتھ ایک یاچند اوصاف وعلل وابستہ کردیئے ہیں،جن کی بنیاد پراس جیسے دوسرے مسائل وجزئیات کا حکم بھی معلوم کیا جاسکتا ہے،مجتہد کی ذمہ داری ہے کہ وہ نصوص میں تدبروتفکر کرکے ان علتوں کا استخراج کرے جوان احکام کے پس پردہ موجود ہیں۔

(۵) احترازی اوراتفاقی قیود کی معرفت۔

(۶) ایسے جامع مانع قاعدہ کا استخراج جس میں حکم کے اطلاق وتقیید یا قیداحترازی واتفاقی کالحاظ رکھا گیا ہو۔

(۷) متعلقہ احکام کے سلسلے میں تخریج شدہ اقوال کا استخراج اورایک باب سے دوسرے باب کی طرف اس کی منتقلی۔

(۸) نئے مسائل کی تفریع عموم احکام واصول کی روشنی میں۔

(۹) اوردلائل میں اختلاف کی صورت میں جمع وتطبیق یا نسخ وترجیح۔

جوعالم مذکورہ امور پرنگاہ رکھے اوران پرمکمل مہارت حاصل کرلے وہ مجتہد مطلق کامقام حاصل کرسکتا ہے،وہ فتاویٰ جاری کرسکتا ہے،اوراس پرکسی دوسرے عالم کی تقلید بھی لازم نہیں رہے گی، بلکہ اگر اللہ توفیق دے اوراس کے لیے اسباب ووسائل فراہم ہوں تودوسروں کے لیے جائز ہوگا کہ وہ ایسے ماہر شخص کی تقلید کریں اوردینی مسائل میں اس پر

اعتماد کریں۔

خود شاہ صاحبؒ نے بھی اس کی تصریح کی ہے کہ انہوں نے یہ فن اولاً حضرت امام شافعیؒ کی کتاب سے حاصل کیا، پھر بعد میں علامہ بغویؒ کی کتاب ''شرح السنۃ'' سے بھی انہوں نے بھرپور استفادہ کیا، انہوں نے یہ فن اگر چیکہ کسی استاذ سے بالمشافہہ نہیں پڑھا، صرف کتابوں کے مطالعہ سے ان کو یہ حاصل ہوا، مگر خود کتابوں سے تحصیل فن کا طریقہ تو بہر حال انہوں نے اپنے اساتذہ اور ائمہ فن سے سیکھا اور پھر اسی کی روشنی میں انہوں نے کتابوں کو اپنا رہنما بنایا، (مقدمہ مصفی شرح موطا علی المسوی: ص۵۳، مطبوعہ بیروت)

حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ علمی اور بصیرت افروز مقدمہ ان کی فنی بصیرت اور اجتہادی صلاحیت کا پتہ دیتا ہے۔

۵

طبقات فقہاء کی مشہور تقسیم اور شاہ صاحبؒ کا نقطۂ نظر:

فقہاء حنفیہ کے یہاں طبقات فقہاء کی بحث بھی کافی پیچیدہ ہوگئی تھی، ابن کمال پاشا رومی (متوفی ۹۴۰ھ) نے اپنے بعض رسائل میں فقہاء کے سات طبقات شمار کرائے تھے، اگر چیکہ حنفی مصنفین عام طور پر اس کا اعادہ کر رہے تھے، مگر پھر بھی بعض حلقوں میں اس تعلق سے کچھ بے یقینی کی کیفیت پائی جاتی تھی، بالخصوص ان طبقات کے تحت جن فقہاء کے اسماء گرامی شمار کرائے جاتے تھے، وہ زیادہ ہدف اعتراض بنتے تھے، علامہ ہارون بن بہاء الدین بن شہاب الدین المرجانی الحنفیؒ نے اس پر کھل کر تنقید کی، مثلاً ابن کمال پاشا کی تقسیم میں حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کو طبقۂ ثانیہ یعنی ''مجتہد فی المذہب'' میں رکھا گیا ہے، جس طبقہ کے فقہاء اصولوں کے استنباط کی قدرت نہیں رکھتے، اصولوں میں وہ اپنے امام کے مقلد ہوتے ہیں، البتہ فروع میں امام کے اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کر سکتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ اصولوں میں بھی اپنے امام سے اختلاف

کرتے ہیں، اور اصول کی کئی کتابوں میں صاحبین کے اصولی اختلاف کا تذکرہ موجود ہے، قاضی ابوزید دبوسیؒ نے ''تاسیس النظر'' میں مستقل ایک باب ان حضرات کے اصولی اختلاف پر قائم کیا ہے، اور اس کا احساس دوسرے مکتب فقہ کے علماء وفقہاء کو بھی ہے۔

علامہ نوویؒ نے تہذیب الاسماء میں ابوالمعالی الجوینی کے حوالے سے امام مزنی کے مختارات کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام مزنی کے مختارات وترجیحات مذہب شافعی کا حصہ ہیں، ان کی کوئی جداگانہ حیثیت نہیں ہے اس لیے کہ امام مزنی حنفیہ میں امام ابویوسفؒ اور امام محمد کے درجے کے مجتہد نہیں ہیں، یہ حضرات تو اصولوں میں بھی اپنے امام سے اختلاف کرتے ہیں جب کہ امام مزنی اختلاف نہیں کرتے۔

علاوہ ازیں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں کئی لوگوں کو اختلاف ہے کہ ان کا شمار فقہاء میں ہونا چاہئے یا حفاظ حدیث میں، امام ابوجعفر طبریؒ نے ان کا شمار فقہاء میں نہیں کیا ہے بلکہ کہا ہے کہ یہ حفاظ حدیث میں ہیں، اس کے باوجود یہ مجتہد مطلق ہیں، تو حضرت امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ مجتہد مطلق کیوں نہیں قرار پاسکتے؟

(النافع الکبیر مقدمہ الجامع الصغیر مولانا عبدالحی لکھنوی: ص ۱۱ر-۱۲ر)

اس کے علاوہ اور بھی کئی اعتراضات کئے گئے ہیں، (تفصیل کے لیے دیکھا جائے، میرا مقالہ ''طبقات فقہاء کی حقیقت'' شائع شدہ ترجمان دارالعلوم دہلی)

ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی حساس فکر نے اس کو کیوں کر محسوس نہ کیا ہوگا؟ شاہ صاحبؒ نے اپنے کسی اعتراض یا احساس کا ذکر کئے بغیر ''الانصاف'' میں طبقات فقہاء کی تقسیم کو ایک دوسرا رخ دے دیا ہے، اور اس طرح عملاً انہوں نے ابن کمال پاشا کی تقسیم کے حق میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کردیا ہے، انہوں نے جو رخ دیا ہے، وہ انتہائی مثبت، معقول اور مبنی برحقیقت ہے، سابقہ تقسیم میں مجتہد کی صرف دو قسمیں تھیں، (۱) مجتہد مطلق مستقل، (۲) مجتہد فی المذہب (مجتہد فی المسائل اصلاً مجتہد نہیں ہوتا) شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں

کہ مجتہد کی تین قسمیں ہیں، (۱) مجتہد مطلق مستقل، (۲) مجتہد مطلق منتسب، (۳) مجتہد فی المذہب۔

(۱) مجتہد مطلق مستقل کے لیے ضروری ہے کہ:

(الف) وہ فقیہ النفس، سلیم الفکر، اور زبردست قوت استنباط کا مالک ہو، قرآن، حدیث، مذاہب سلف، لغت اور قیاس ان پانچوں چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو، نصوص اور آثار پر ایسی گہری نگاہ ہو کہ وہ مختلف دلائل میں جمع و تطبیق اور نسخ و ترجیح کا فیصلہ کرسکتا ہو۔

(ب) مسائل کے استنباط کے لیے خود اصول وقواعد مقرر کرتا ہو، اور اس میں وہ کسی کا مقلد نہ ہو۔

(ج) نئے پیش آمدہ مسائل و جزئیات کی تفریع کرتا ہو۔

تعریف کے یہ تین ٹکڑے دوسرے فقہاء کے یہاں بھی ملتے ہیں، شاہ صاحبؒ نے اس میں ایک چوتھے ٹکڑے کا اضافہ کیا کہ:

(د) اسے آسمانی مقبولیت بھی حاصل ہو اور علماء، فقہاء، مفسرین، محدثین اور اصولیین کی مختلف جماعتوں نے اس کے طرز اجتہاد اور مجتہدات کو قبول اور یہ سلسلہ صدیوں جاری رہا ہو اور اس کے ماننے والے بڑی تعداد میں ہر دور میں موجود رہے ہوں، مثلاً ائمہ اربعہ، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ۔

(۲) مجتہد مطلق منتسب: وہ ہے جو ان تمام شرائط اجتہاد کا حامل ہو، جن کا ذکر مجتہد مطلق مستقل میں کیا گیا ہے، اسی لیے وہ اصولوں میں بھی امام سے اختلاف رکھتا ہو، یہ بھی مجتہد مطلق ہی ہوتا ہے، مگر منہج فکر، اور طریق استنباط اس نے اپنے امام سے حاصل کیا ہو، اور اس کا فکری اور اجتہادی زاویہ اپنے امام کے طرز اجتہاد سے ماخوذ ہو، اور اسی بناء پر وہ اپنے امام کی طرف منسوب ہو۔

(۳) مجتہد فی المذہب: وہ ہے جو تخریج واستنباط کی مکمل صلاحیت رکھتا ہو،

اپنے مذہب کا بصیرت مند اور محقق عالم ہو، مذہب کے اصولوں اور تفصیلی دلائل سے پوری طرح باخبر ہو، وہ جزئیات اور نئے پیش آمدہ مسائل میں اپنے مذہب کے اصول کی روشنی میں استنباط کرسکتا ہو، مگر اصول میں وہ اپنے امام کا پابند ہو، اصولی طور پر وہ اپنے امام سے اختلاف نہ کرسکتا ہو۔

شاہ صاحبؒ نے ان تینوں درجات کو طب اور شاعری کی مثالوں سے بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے، اور کہا ہے کہ یہ تقسیم، علم تفسیر، تصوف، اور دیگر علوم میں بھی جاری ہوگی۔

(الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف: ص۹۸-۸۳ر)

اگرچہ یہ کوئی نئی فکر شاہ صاحبؒ نے پیش نہیں کی ہے، بلکہ اس کی جڑیں شاہ صاحبؒ سے قبل کے مصنفین و محققین شوافع کے یہاں موجود ہیں، حافظ ابن حجر مکیؒ نے اپنے رسالہ ''شن الغارۃ علی من اظہر معرۃ تقولہ فی الحنا وعوارہ'' میں اس تقسیم کا ذکر کیا ہے، اسی طرح میزان میں علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ نے بھی علامہ جلال الدین سیوطیؒ کے حوالے سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر: ص۱۴ر)

لیکن مجدد کا کام یہ نہیں کہ وہ ہر بات میں نئی چیز پیش کرے، بلکہ اس کا اصل کام یہ ہے کہ وہ کسی چیز کو بروقت اور نئے طور پر پیش کرے، اور یہ کام ہی نہیں، کارنامہ شاہ صاحبؒ نے بخوبی انجام دیا ہے''۔

۶

سلسلۂ اجتہاد جاری ہے یا نہیں؟:

یہاں ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ سلسلۂ اجتہاد جاری ہے یا موقوف ہو چکا؟ یہ مسئلہ بھی گذشتہ ادوار میں کافی موضوع بحث رہ چکا ہے، میزان میں امام عبدالوہاب شعرانیؒ نے جلال الدین سیوطی سے نقل کیا ہے کہ اجتہاد کی دو قسمیں ہیں، اجتہاد مطلق غیر منتسب، مثلاً ائمہ اربعہ کا اجتہاد، اور اجتہاد مطلق منتسب مثلاً ان ائمہ کے تلامذہ اور اصحاب کا اجتہاد۔

اجتہاد مطلق غیر منتسب کا دعوی ائمہ اربعہ کے بعد کسی نے نہیں کیا، صرف ایک امام محمد بن حریر طبریؒ نے اس کا دعویٰ کیا تھا، مگر کسی نے اس کو تسلیم نہیں کیا، رہا یہ کہ عقلا اب کسی کے لیے ائمہ اربعہ میں سے کسی کے مقام تک پہونچنا ممکن ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہونچنا ممکن ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اور قرآن وحدیث میں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جس سے عدم امکان یا عدم وقوع ثابت ہوتا ہو، لیکن واقعاتی طور پر ائمہ اربعہ کے بعد کوئی اس مقام تک نہیں پہونچ سکا، امام طبری نے دعویٰ بھی کیا تو لوگوں نے قبول نہیں کیا........اس لیے کہ اب کوئی منہج اجتہاد یا طرز استنباط باقی نہیں جو سابقہ ائمہ نے استعمال نہ کیا ہو، اس لیے بعد میں آنے والا ہر امام انہی مناہج استنباط میں سے کسی ایک منہج کو اختیار کرنے پر مجبور ہے، جو ائمہ اربعہ نے اختیار کیا تھا، اور یہ اجتہاد منتسب ہے، جس کا دروازہ بند نہیں ہے، البتہ کوئی نیا منہج استنباط پیدا کرنا اب عملا ناممکن ہے۔

(النافع الکبیر: ص۱۴-۱۵)

علامہ بحر العلوم لکھنوی نے ''شرح تحریر الاصول'' میں اور ''شرح مسلم الثبوت'' میں اس خیال کی سختی سے تردید کی ہے، کہ ائمہ اربعہ کے بعد اجتہاد مطلق کا اور صاحب ''الکنز'' علامہ نسفی کے بعد اجتہاد فی المذہب'' کا دروازہ بند ہو چکا ہے، علامہ بحر العلوم نے اس کو بالکل بے بنیاد اور تعصب وتنگ نظری کی پیداوار قرار دیا ہے، اور اس کو فتویٰ بلا علم، ضلالت اور دعویٰ غیب جیسے سخت الفاظ سے تعبیر کیا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی تصنیفات میں اس نازک مسئلہ سے تعرض فرمایا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے انصاف کی بات کہی ہے، شاہ صاحبؒ کا انداز بیان انتہائی مبصرانہ اور حقیقت پسندانہ ہے، اس میں انہوں نے کسی جانبداری کے بغیر صرف واقعات اور حقائق کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔

(النافع الکبیر: ص۱۵-۱۶)

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مسئلہ کو فکری اور نظریاتی طور پر دیکھنے کے بجائے

واقعاتی طور پر دیکھنے کی کوشش کی ہے، اور انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے یہ اشارہ دیا ہے کہ بحث عقلی امکان یا شرعی جواز کی نہیں ہے کہ خود یہ اصطلاحات شریعت کی اساسیات میں موجود نہیں ہیں، تو پھر اس پر شریعت سے دلیل کیوں مانگی جائے؟ اور جو چیز تاریخ میں ایک بار وقوع پذیر ہو چکی اس کے بارے میں عقلی عدم امکان کا سوال کیوں اٹھایا جائے؟ مگر واقعہ کیا ہے؟ اور تاریخی حقائق کیا کہتے ہیں؟ فیصلہ ان کی روشنی میں ہوگا.......

مجتہدین کا یہ سلسلہ مرضیِ الٰہی سے شروع ہوا اور بطور ایک نعمت کے یہ اجتہاد اس امت مرحومہ کو دیا گیا، یہ نعمت کب تک کس معیار کی باقی رہنی چاہئے، اس کے لیے کوئی شرعی دلیل نہیں پیش کی جا سکتی، لیکن واقعات اور تاریخی حقائق کے تناظر میں یہ فیصلہ ممکن ہے، کہ اللہ کی مرضی اس نعمت کے کس معیار کی کب تک رہی؟ اور کب تک نہیں رہی؟

واقعہ یہ کہ شاہ صاحبؒ نے مسئلہ کی بہت اہم نبض پکڑی ہے، اور موضوع کی آخری تہ تک پہونچ گئے ہیں۔

اجتہادِ منتسب واقعاتی طور پر ممکن ہے:

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں اجتہادِ مطلق مستقل کی جہاں تک بات ہے، تو عقلی طور پر ممکن ضرور ہے، مگر بعد میں علوم وفنون میں جو پھیلاؤ پیدا ہوا اور عہد نبوت سے دوری کی بنا پر قرآن وحدیث سے سمجھنے کے لیے طرح طرح کے اتنے علوم وضع کئے گئے، کہ کسی ایک شخص کے لیے بیک وقت ان تمام میں مکمل مہارت حاصل کرنا ممکن نہ رہا، اور جب تک کہ تمام علوم ضروریہ میں مکمل مہارت نہ ہو اجتہاد کے اعلیٰ مقام تک انسان نہیں پہونچ سکتا۔

والنفس الانسانية وان كانت زكية لها حد معلوم تعجز عما وراءه وانما كان هذا ميسر اللطراز الاول من المجتهدين حين كان العهد قريبا والعلوم غير منشعبة على انه لم يتيسر ذلك ايضا الالنفوس قليلة وهم مع ذلك كانوا مقيدين

بمشائخهم معتمدين عليهم ولكن لكثرة تصرفاتهم في العلم صاروا مستقلين (الانصاف:ص۲۷)

''یعنی نفس انسانی خواہ کتنا ہی پاکیزہ ہو مگر اس کی ایک حد مقرر ہے، اس سے زیادہ وہ پرواز نہیں کرسکتا، یہ صرف پہلے طرز کے مجتہدین ہی کے لیے ممکن تھا، اس لیے کہ عہد نبوت قریب تھا، اور علوم میں اس قدر پھیلاؤ اور انتشار نہ تھا، اس کے باوجود متقدمین میں بھی صرف چند نفوس ہی کو یہ مقام (اجتہاد مطلق مستقل) حاصل ہوسکا، اور خود وہ بھی اپنے اساتذہ ومشائخ کے طرز اجتہاد کے پابند تھے، مگر اس علم میں ان کے کثرت تصرف کی بنا پر یہ حضرات خود مستقل بالذات ہوگئے''۔

اس مقام پر حضرت شاہ صاحبؒ نے امام بلقینی (جوکہ مجتہد مطلق منتسب کے مقام پر فائز تھے) اور ان کے تلمیذ امام ابوزرعہ کا ایک دل چسپ مکالمہ درج کیا ہے۔

''ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے شیخ امام بلقینیؒ سے کہا کہ شیخ تقی الدین السبکی کے اجتہاد میں کیا کمی ہے؟ وہ تو پورے مجتہد ہیں، پھر کیوں تقلید کرتے ہیں؟ میں نے اس موقعہ پر خود اپنے شیخ حضرت بلقینی کا ذکر لحاظاً نہیں کیا، ورنہ میں چاہتا تھا کہ شیخ سبکی کے ساتھ خود ان کا نام بھی لے کر پوچھوں میرے اس سوال پر وہ خاموش رہے، میں نے عرض کیا شاید اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ دور میں جتنے عہدے اور مناصب ہیں وہ مذاہب اربعہ کے مقلدین کے لیے مخصوص ہیں، اگر وہ ان کے دائرۂ تقلید سے نکل جائیں اور اجتہاد مستقل کا دعویٰ کر بیٹھیں تو ان کو کوئی عہدہ نہیں مل سکے گا، اور وہ مقام قضا سے محروم کردیئے جائیں گے، لوگ ان سے استفتاء کرنا ترک کردیں گے، اور ان پر بدعتی ہونے کا الزام آجائے گا، .... میری بات پر حضرت بلقینی مسکرائے اور اس طرح گویا مجھ سے اتفاق کا اظہار فرمایا''۔

شاہ صاحبؒ نے یہ مکالمہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں اور

میں اس بدگمانی کو مناسب نہیں سمجھتا کہ ان عظیم ہستیوں نے محض قضا اور دنیا کے عارضی عہدوں کے حصول کے لیے اپنے فرائض منصبی کے بارے میں کتمان کا معاملہ فرمایا، یہ ان بلند و بالا شخصیات کے ساتھ حق تلفی اور ناانصافی ہے، اور شیخ بلقینی کا محض مسکرانا اتفاق کی دلیل نہیں ہے، اصل بات وہی ہے، جس کا تذکرہ ''علامہ جلال الدین سیوطیؒ'' نے اپنی کتاب ''شرح التنبیہ فی باب الطلاق'' میں کیا ہے، کہ اس طرح کی جن شخصیات کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اجتہاد مطلق کے مقام پر پہونچ چکے تھے، اس کا مطلب اجتہاد مستقل نہیں بلکہ اجتہاد مطلق منتسب ہے، صاحب التنبیہ، بلقینی، ابن الصباغ، امام الحرمین، اور امام غزالی یہ تمام حضرات اجتہاد مطلق منتسب کے مقام پر فائز تھے، نہ کہ اجتہاد مستقل کے مقام پر۔

(الانصاف: ص ۴۳)

رہا یہ کہ ''اجتہاد مطلق منتسب'' کے مقام پر اب کوئی فائز ہوسکتا ہے یا نہیں؟ تو علامہ نوویؒ نے ''شرح المہذب'' میں اس کی تصریح کی ہے، کہ یہ مقام تاقیام قیامت باقی رہے گا، شرعاً اس کا انقطاع جائز نہیں، اس لیے کہ یہ فرض کفایہ ہے، اگر تمام اہل زمانہ بالکلیہ اس کو ترک کردیں تو سب گنہ گار ہوں گے، جیسا کہ علامہ ماوردی، علامہ رویانی اور علامہ بغوی نے اس کی صراحت کی ہے، (الانصاف: ۴۴)

شاہ صاحبؒ نے تاریخی طور پر مذاہب اربعہ کا تجزیہ بھی کیا ہے، کہ کس مذہب میں کس درجہ کے مجتہدین کس صدی تک ہوئے؟ اس تجزیے کے بعض حصوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مگر فی الواقع یہ تجزیہ بصیرت افروز ہے۔

شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

مذہب حنفی میں تیسری صدی ہجری کے بعد اجتہاد مطلق منتسب کا سلسلہ ختم ہوگیا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقام پر وہی فائز ہوسکتا ہے، جو اقوال فقہاء اور قواعد فقہیہ کے ساتھ حدیث پر بھی پوری مہارت رکھتا ہو، اور حنفیہ ہمیشہ اس باب میں پیچھے رہے، البتہ

''اجتہاد فی المذہب'' (جس کی ادنی شرط یہ ہے کہ سرخسی کی مبسوط کا حافظ ہو،) کا سلسلہ جاری ہے۔

اسی طرح مذہب مالکی میں بھی مجتہد منتسب کم ہوئے، اور جو لوگ اس مقام پر پہونچے ان کے تفردات مذہب کا حصہ نہ بن سکے، مثلاً ابن عبد البرؒ، اور قاضی ابوبکر بن العربیؒ۔

مذہب حنبلی کا دائرہ ہر دور میں بہت مختصر رہا لیکن نویں صدی تک ہر طبقہ میں مجتہدین ہوتے رہے، پھر اس کا زور ہی ٹوٹ گیا، اور مصر و بغداد کے علاوہ دنیا کے دیگر حصوں میں اس کے ماننے والوں کی تعداد بہت مختصر رہ گئی۔

علاوہ ازیں امام احمد کے مذہب کی حیثیت، مذہب شافعی کے بالمقابل ویسی ہی ہے، جیسی کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمد کے مذہب کی مذہب ابوحنیفہ کے مقابلے میں، فرق صرف اتنا ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا مذہب امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے ساتھ مدون کیا گیا جب کہ امام احمد کا مذہب، مذہب شافعی کے ساتھ مدون نہیں کیا گیا، جس کی بناء پر اس کو الگ مذہب سمجھ لیا گیا، ورنہ اگر غور کیا جائے تو فی الواقع یہ جداگانہ مذہب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

البتہ تاریخی طور پر مذہب شافعی میں مجتہد مطلق، اور مجتہد فی المذہب بکثرت ہوئے ہیں، اسی طرح تمام مذاہب کے مقابلے میں اصولیین، متکلمین، مفسرین قرآن، شارحین حدیث، اور ممتاز اور بصیرت مند فقہاء، مذہب شافعی میں زیادہ پیدا ہوئے......مذاہب کا مطالعہ و تحقیق کرنے والے شخص کے لیے یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے، امام شافعیؒ کے اصحاب خود بھی اجتہاد مطلق کے مقام پر فائز تھے، اور بہت کم لوگ ایسے تھے جو امام شافعیؒ کے تمام مجتہدات کی تقلید کرتے تھے، ابن شریح تک یہی معاملہ رہا، ابن شریح نے تقلید و تخریج کے قواعد کی بنیاد ڈالی، تو پھر مذہب شافعی نے اسی رخ پر اپنا سفر شروع کیا، اور بعد کے فقہاء نے ابن شریح کے بنائے ہوئے اصولوں کو اپنے فقہی اور اجتہادی کاموں میں رہنما خطوط

کے طور پر اپنے سامنے رکھا۔ (الانصاف :ص ۸۴-۸۵)

یقیناً شاہ صاحبؒ نے یہ فیصلہ مذاہب اور تاریخ کے گہرے مطالعہ کے بعد فرمایا ہے، البتہ مذہب حنفی میں مجتہد منتسب کم ہونے کی وجہ شاہ صاحبؒ نے جو شغل حدیث کی کمی بتائی ہے، ممکن ہے بعض ناقدین کو اس سے اختلاف ہو اس لیے کہ مذہب حنفی میں حفاظ حدیث کی کبھی کمی نہیں رہی، یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اس کو اپنی تصنیفات وتالیفات کا موضوع نہیں بنایا کہ یہ خدمت کرنے والے لوگ بکثرت موجود تھے، اس لیے انہوں نے فن حدیث پر مکمل مہارت کے باوجود علم فقہ پر توجہ دی، اور اس کو اپنی تحقیقات وتصنیفات کا موضوع بنایا۔

ورنہ تیسری صدی کے بعد (جس کے بارے میں شاہ صاحبؒ کا خیال ہے کہ اس مذہب میں اشتغال بالحدیث کی کمی کی بنا پر اجتہاد مطلق منتسب کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا) بھی حنفیہ میں بڑے بڑے حفاظ حدیث ہوتے رہے، مثلا حافظ ابو بشر الدولابی، حافظ ابو جعفر الطحاوی، حافظ ابن ابی العوام السعدی، حافظ ابو محمد الحارثی، صاحب مسند ابی حنیفہ، حافظ عبد الباقی، حافظ ابو بکر الرازی الجصاص، حافظ ابو نصر الکلاباذی، حافظ ابو محمد السمرقندی، حافظ شمس الدین السروجی، حافظ قطب الدین الحلبی، حافظ علاء الدین الماردینی، حافظ جمال الدین الزیلعی، حافظ علاء الدین مغلطائی، حافظ بدر الدین العینی، اور حافظ قاسم بن قطلو بغا وغیرہ۔

اسی طرح مالکیہ میں بھی بڑے بڑے حفاظ حدیث پیدا ہوئے، مثلا حافظ حسین بن اسماعیل القاضی، حافظ الاصیلی، حافظ ابن عبد البر الاندلسی، حافظ ابو الولید الباجی، حافظ قاضی ابو بکر العربی، حافظ عبد الحق صاحب الاحکام، حافظ قاضی عیاض الیحصبی، حافظ المازری، حافظ ابن رشد الفقیہ صاحب المقدمات، اور حافظ ابو القاسم السہیلی، وغیرہ۔

(مقدمہ فیض الباری شرح البخاری، علامہ یوسف بنوری :ص ۱۴-۱۵)

البتہ ایک بڑی قابل توجہ بات علامہ مناظر احسن گیلانیؒ نے تحریر فرمائی ہے:

''حنفیوں کی فقہ کو مشرق میں اور مالکیوں کی فقہ کو مغرب میں چونکہ عموما حکومتوں کے دستور العمل کی حیثیت سے تقریبا ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک استعمال کیا گیا، اس لیے قدرتاً ان دونوں مکاتب خیال کے علماء کی توجہ زیادہ تر جدید حوادث و جزئیات و تفریعات کے ادھیڑ بن میں مشغول رہی، بخلاف شوافع اور حنابلہ کے کہ بہ نسبت حکومت کے ان کا تعلق زیادہ تر تعلیم و تعلم، درس و تدریس اور تالیف و تصنیف سے رہا، اس لیے عموما تحقیق و تنقید کا وقت ان کو زیادہ ملتا رہا، (تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہ: ص۲۴۳)

بہر حال شاہ صاحبؒ اجتہاد (بمعنی اجتہاد منتسب یا اجتہاد فی المذہب) کو موقوف تسلیم نہیں کرتے، ان کے نزدیک فی الجملہ اجتہاد کی ضرورت ہر دور میں ہے، اور یہ ضرورت اب اجتہاد مطلق مستقل کی صورت سے پوری نہیں ہوسکتی، اس لیے اب یا تو اجتہاد منتسب کے ذریعہ یہ ضرورت پوری ہوگی، یا اجتہاد فی المذاہب کے ذریعہ۔

مقدمۂ مصفیٰ میں لکھتے ہیں:

''اجتہاد ہر زمانہ میں فرض کفایہ ہے، یہاں اجتہاد سے مراد اجتہاد مستقل نہیں جیسا کہ امام شافعی کا اجتہاد تھا، جو جرح و تعدیل، زبان دانی وغیرہ میں کسی کے محتاج نہ تھے، اور اسی طرح اپنی مجتہدانہ درایت میں (اپنے پورے اقسام کے ساتھ) وہ دوسرے کے تابع نہ تھے بلکہ مقصود اجتہاد منتسب ہے اور وہ نام ہے احکام شرعی کو ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ جاننے کا، اور مجتہدین کے طریقے پر تفریع مسائل اور ترتیب احکام کا، اگرچہ وہ کسی صاحب مذہب کی رہنمائی سے ہو۔

اور ہم جو یہ کہتے ہیں کہ اجتہاد اس زمانے میں فرض ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسائل کثیر الوقوع ہیں جن کا احاطہ ممکن نہیں، اور ان کے بارے میں اللہ کا حکم جاننا واجب ہے، اور جو تحریر و تدوین میں آچکا ہے، وہ ناکافی ہے، اور ان کے بارے میں اختلافات بہت ہیں، جن کا حل کرنا دلائل کی طرف رجوع کئے بغیر ممکن نہیں، ائمہ مجتہدین سے جو مسائل کی

روایات منقول ہیں، ان میں اکثر میں انقطاع ہے، کہ قلب ان پر اطمینان کے ساتھ اعتماد نہیں کرسکتا، اس لیے ان کو قواعد اجتہاد پر پیش کئے اور تحقیق کئے بغیر معاملہ بنتا نہیں۔

(مقدمہ مصفیٰ علی المسویٰ: ص ۲۹-۳۰ / مطبوعہ بیروت)

۷

مسئلہ تقلید

تقلید ائمہ کا مسئلہ بھی بڑا اختلافی رہا ہے، اور ہر دور میں لوگ اس تعلق سے افراط وتفریط کا شکار رہے ہیں، ایک طرف ابن حزم اور ظاہر پرست حضرات ہیں، جو تقلید کو بالکل حرام اور شرک کے مترادف سمجھتے ہیں، دوسری طرف غالی مقلدین کا گروہ ہے، جو کتب فقہ کی تمام جزئیات کو بالکل وہی درجہ دیتا ہے جو قرآن وحدیث کا ہے، اور اس سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں، شاہ صاحبؒ نے ان دونوں کے درمیان نقطۂ عدل اختیار فرمایا ،ایک طرف ابن حزم کے قول کا محل متعین کیا، دوسری طرف تقلید کا مطلب واضح کیا، کہ تقلید کی حقیقت کیا ہے، اور لوگ ائمہ کی تقلید کیوں کرتے ہیں؟ اسی طرح تاریخی طور پر اس پر بھی روشنی ڈالی کہ چوتھی صدی سے قبل تک لوگ تقلید شخصی تو کرتے تھے، مگر کسی ایک شخص یا ایک مذہب کی لازمی تعیین کے ساتھ نہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ عہد نبوت قریب تھا، ہویٰ وہوس کا اتنا غلبہ نہ تھا، علماء وفقہاء بھی بآسانی میسر تھے، اس لیے ہر شخص کو اس کی اجازت تھی کہ جس سے چاہے مسئلہ دریافت کرے، لیکن بعد میں ہویٰ وہوس کی کثرت کی بنا پر ہر شخص قابل اعتماد نہیں رہا، اور لوگ مسائل کے استفادہ کے لیے شخصیات کے انتخاب میں خواہش نفس کو دخیل بنانے لگے، اس ضرورت کے تحت ''مذہبی تعیین'' کی ضرورت پیدا ہوئی، اور لوگوں کو راہ حق وہدایت پر مستقیم رکھنے کے لیے متعینہ طور پر کسی ایک مذہب کی تقلید ضروری قرار دی گئی، گویا یہ امت کی دینی ضروریات کے لیے ایک انتظامی حکمت عملی تھی۔

غرض اس بارے میں شاہ صاحبؒ نے جو مسلک اختیار کیا اور اس کی جو تعبیر کی وہ روح شریعت سے قریب تر، قرن اول کے عمل سے زیادہ ہم آہنگ، فطرت انسانی سے زیادہ

مطابق اور عملی زندگی سے سازگار ہے، شاہ صاحبؒ تقلید کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

سب کو معلوم ہے کہ استفتاء اور افتاء کا سلسلہ عہد نبویؐ سے لے کر برابر چلتا رہا ہے، اور ان دونوں میں کیا فرق ہے کہ ایک آدمی ہمیشہ ایک سے فتویٰ لیتا ہے، یا کبھی ایک سے لیتا ہے اور کبھی دوسرے سے، ایسی حالت میں کہ اس کا ذہن صاف ہے، اس کی نیت سلیم ہے اور وہ صرف اتباع شریعت چاہتا ہے، یہ بات کیسے جائز نہیں؟ جب کہ کسی فقیہ کے بارے میں ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر آسمان سے فقہ اتاری، اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے، اور یہ کہ وہ معصوم ہے، تو اگر ہم نے ان فقہاء اور ائمہ میں سے کسی کی اقتداء کی تو محض اس بنا پر کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہے، اس کا قول (فتویٰ) دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں یا وہ کتاب وسنت کے صریح حکم پر مبنی ہے یا وہ استنباط کے اصولوں میں سے کسی اصول کے مطابق اس سے مستنبط کیا ہوا ہے، یا اس نے قرائن سے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ حکم فلاں علت کے ساتھ وابستہ ہے، (اور وہ علت یہاں پائی جاتی ہے) اور اس کا قلب اس بات پر مطمئن ہو گیا ہے، اس بنا پر اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا، گویا وہ زبان حال سے کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جہاں یہ علت پائی جائے وہاں حکم یہ ہوگا، اور یہ قیاسی مسئلہ اس عموم اور کلیہ میں شامل ہے، اس طرح اس حکم کی نسبت بھی آنحضرت ﷺ کی طرف کی جا سکتی ہے، لیکن ظنی طریقوں پر، اگر صورت حال یہ نہ ہوتی تو کوئی صاحب ایمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا، اگر ہمیں رسول معصوم ﷺ جن کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے، کی کوئی حدیث قابل وثوق سند سے پہونچے جو اس مجتہد یا امام کے فتویٰ اور قول کے خلاف ہو، اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں، اور اس ظنی طریقہ کی پیروی کریں تو ہم سے بڑھ کر ناروا طریقہ اختیار کرنے والا کون ہوگا، اور کل ہمارا خدا کے سامنے کیا عذر ہوگا؟ (حجۃ اللہ البالغۃ: ص ۱۵۶)

علامہ ابن حزم جو تقلید کے خلاف ہیں ان کے قول کا محل متعین کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ابن حزم کے قول کا مصداق وہ شخص نہیں جو رسول اللہ ﷺ کے قول کے علاوہ کسی کو اپنے لیے واجب الاطاعت نہیں سمجھتا، وہ حلال اسی کو گردانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا اور حرام اسی کو مانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام کیا، لیکن چونکہ اس کو براہ راست آنحضرت ﷺ (کے اقوال واحوال) کا علم حاصل نہیں اور وہ آپ کے مختلف اقوال میں تطبیق دینے کی صلاحیت اور آپ کے کلام سے مسائل استنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا وہ کسی خداترس عالم دین کا دامن پکڑ لیتا ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صحیح بات کہتا ہے، اور اگر مسئلہ بیان کرتا ہے تو اس میں وہ محض سنت نبوی ﷺ کا پیرو اور ترجمان ہوتا ہے، جیسے ہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح نہیں تھا اسی وقت وہ بغیر کسی بحث واصرار کے اس کا دامن چھوڑ دیتا ہے، بھلا ایسے آدمی کو کوئی کیسے مطعون کرے گا، اور اس کو سنت وشریعت کا مخالف کیوں کر قرار دے گا۔ (حجۃ اللہ البالغۃ: ص ۱۵۵)

اس قول کا مصداق وہ عامی مقلد ہے جو اپنے امام کے بارے میں یہ تصور رکھے کہ اس سے غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے، اور اس کی ہر بات قطعی طور پر درست ہے، نیز اس کا عزم ہو کہ وہ اس کی تقلید کبھی ترک نہیں کرے گا، چاہے اس کے خلاف کتنی ہی مضبوط دلیلیں آجائیں۔

اسی طرح اس میں وہ شخص بھی آتا ہے جو اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ ایک حنفی کسی شافعی فقیہ یا شافعی کسی حنفی فقیہ سے فتویٰ پوچھے یا اس کے پیچھے نماز پڑھے، اس لیے کہ یہ اجماع سلف اور صحابہ وتابعین کرام کے عمل کے خلاف ہے۔

یہ ہے ابن حزم کے قول کا منشاء، ان قیود وشرائط کو ملحوظ رکھ کر اس کا اطلاق کیا جائے گا، اور جہاں صورت حال یہ نہ ہو وہاں تک اس کا دائرہ وسیع نہیں ہوسکتا۔

(الانصاف:ص ۱۰۰-۱۰۱)

مذاہب اربعہ کی تخصیص:

البتہ چوتھی صدی ہجری سے قبل تک مذاہب اربعہ کے علاوہ دوسرے مجتہدین کی بھی تقلید کی جاتی تھی، لیکن دوسرے حضرات مجتہدین کے مذاہب گردش ایام کے اثر سے پوری طرح محفوظ نہ رہ سکے، اور نہ ان کے پیروکاروں کی تعداد باقی رہی، اب ان کے وہی اقوال وآراء محفوظ رہ گئے ہیں جو مذاہب اربعہ کی کتابوں میں مختلف مناسبتوں سے مذکور ہوئے ہیں، اس لیے چوتھی صدی ہجری کے بعد ان مذاہب اربعہ کے سوا کوئی مذہب باقی نہ رہا، اس لیے حکمت الٰہی سے قدرتی طور پر تقلید شخصی انہی چار مذاہب میں منحصر ہوکر رہ گئی، حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید'' میں اس پر بہت محققانہ اور تفصیلی گفتگو کی ہے،.........ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''یاد رکھو کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار میں بڑی مصلحت ہے، اور ان چاروں کو بالکل نظر انداز کردینے میں بڑا مفسدہ ہے، اس کے کئی وجوہ واسباب ہیں، ایک یہ کہ امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے کے بارے میں سلف متقدمین پر اعتماد کیا جائے، تابعین نے اس بارے میں صحابہ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر علی ہذا القیاس ہر دور کے علماء نے اپنے پیشروں پر اعتماد کیا، عقل سے بھی اس کا مستحسن ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لیے کہ شریعت کے علم کا ذریعہ نقل اور استنباط ہے، اور نقل جب ہی ممکن ہے جب ہر طبقہ اپنے اس پہلے طبقہ سے جو اس سے متصل ہے اخذ کرے، استنباط میں بھی یہ ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب معلوم ہوں، تاکہ ان کے اقوال کے دائرہ سے خارج ہوکر خرق اجماع نہ ہوجائے، اس لیے ان اقوال کے جاننے اور سابقین سے مدد لینے کی ضرورت ہے دوسرے علوم وفنون اور ہنروں اور پیشوں کا بھی یہی حال ہے، صرف، نحو، طب، شاعری، لوہاری، بخاری، رنگ ریزی، سب اسی وقت حاصل ہوتے ہیں جب ان کے

استادوں اور ان کے ساتھ اشتغال رکھنے اولوں کی صحبت اختیار کی جائے، اس کے بغیر مہارت حاصل نہیں ہوتی، اگرچیکہ عقلا ایسا ممکن ہے، لیکن واقعۃً ہوتا نہیں۔

جب یہ بات متعین ہوگئی کہ سلف کے اقوال وتحقیقات پر اعتماد ضروری ہے، تو پھر یہ ضروری ہوگیا کہ جن اقوال پر اعتماد کیا جارہا ہے، وہ سند صحیح سے مروی اور مشہور کتابوں میں مدون ہوں، اور ان پر ایسا کام ہوا ہو کہ اس میں راجح اور مرجوح اور عام وخاص کا امتیاز آسان ہو، جہاں اطلاق پایا جاتا ہے، وہاں یہ پتہ چل سکے کہ اس میں مقید کیا ہے؟ مختلف اقوال میں تطبیق دی جاچکی ہو، اور احکام کے علل پر روشنی ڈالی جاچکی ہو، نہیں تو ایسے مذاہب واجتہادات پر اعتماد صحیح نہیں ہوگا، ان پہلے ادوار میں کوئی مذہب (فقہی) بھی ایسا نہیں ہے، جس میں یہ صفات موجود ہوں اور یہ شرطیں پوری ہوتی ہوں، سوائے ان مذاہب اربعہ کے۔

او رجب ان مذاہب اربعہ کے علاوہ دیگر تمام مذاہب حقہ مٹ گئے، تو انہی مذاہب اربعہ کی اتباع سواد اعظم کی اتباع مانی جائے گی، اور ان کی اتباع سے خروج، سواد اعظم سے خروج مانا جائے گا۔

ولما اندرست المذاهب الحقة الاهذه الاربعة كان اتباعها اتباعا للسواد الاعظم والخروج عنها خروجا عن السواد الاعظم.

(عقد الجید: ص ۳۷-۳۸)

اوران مذاہب کی اتباع بھی علی العموم نہیں بلکہ کسی ایک مذہب کی اتباع لازم ہے، دوسری صدی سے قبل تک اس میں توسع تھا، مگر اس کے بعد یہ توسع ختم کردیا گیا، اس لیے کہ اب نہ وہ ورع واحتیاط رہی، اور نہ وہ خوفِ خدا اور جذبۂ تحقیق حق باقی رہا، اگر آج اس بات کی کھلی آزادی دے دی جائے کہ جس مجتہد کا چاہو قول اختیار کرلو تو دین ایک کھلونا بن کر رہ جائے گا، کیونکہ اکثر مجتہدین کے یہاں کچھ نہ کچھ منفرد اقوال ایسے ملتے ہیں جن کو خواہشات نفس کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے انہی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بڑی تاکید کے ساتھ کہا ہے کہ:

وبعد المأتين ظهر فيهم التمذهب للمجتهدين باعيانهم وقل من كان لايعتمد على مذهب مجتهد بعينه وكان هذا هو الواجب في ذلك الزمان (الانصاف:ص۷۰)

دوسری صدی ہجری کے بعد متعینہ طور پر کسی مجتہد کے مذہب کو اختیار کرنے کا رجحان پیدا ہوا، اور بہت کم لوگ ایسے رہے جو کسی معین مذہب کے پابند نہ ہوں، اور اس زمانے میں یہی واجب تھا"۔

تقلید واجب لغیرہ ہے:

البتہ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ جو چیز عہد نبوت میں واجب نہ تھی وہ بعد میں کیسے واجب ہوگئی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ واجب کی دو قسمیں ہیں، ایک واجب لعینہٖ، دوسرے واجب لغیرہ، واجب لعینہ تو وہی چیزیں ہیں جن کو عہد رسالتؐ میں واجب کر دیا گیا، اس کے بعد ان میں اضافہ نہیں ہوسکتا، لیکن واجب لغیرہ میں اضافہ ہوسکتا ہے، وہ اس طرح کہ مقصود تو ایک واجب کی ادائیگی ہوتی ہے، لیکن اگر اس واجب کی ادائیگی کا کسی زمانہ میں صرف ایک طریقہ رہ جائے تو وہ طریقہ بھی واجب ہو جاتا ہے، مثلاً عہد رسالتؐ میں احادیث کی حفاظت واجب تھی لیکن کتابت واجب نہ تھی، کیونکہ حفاظت حدیث کا فریضہ محض حافظہ سے بھی ادا ہوسکتا ہے، لیکن بعد میں جب حافظہ پر اعتماد نہ رہا، تو حفاظت حدیث کا کوئی طریقہ بجز کتابت کے باقی نہ رہا، اس لیے کتابت واجب ہوگئی، اسی طرح عہد صحابہ و تابعین میں غیر مجتہد کے لیے مطلق تقلید واجب تھی، لیکن جب تقلید مطلق کا راستہ پرخطر ہوگیا تو صرف تقلید شخصی ہی کو واجب قرار دیا گیا۔

(الانصاف:ص۷۷-۷۸)

اس کلیہ کے مطابق اگر کہیں مذہب حنفی کے سوا کسی مذہب کے علماء وفقہاء نہ ہوں تو مذہب حنفی ہی کی تقلید لازم ہے، اس سے خروج جائز نہیں، اس لیے کہ مذہب حنفی سے خروج اسلام سے خروج کا سبب بن جائے گا۔

وعلى هذا ينبغي ان القياس وجوب التقليد لامام بعينه فانه قديكون واجبا وقد لايكون واجبا فاذا كان انسان جاهل فى بلاد الهند اوفى بلاد ماوراء النهر وليس هناك عالم شافعي ولامالكى ولاحنبلى ولا كتبا من كتب هذه المذاهب وجب عليه ان يقلد لمذهب ابى حنيفة ويحرم عليه ان يخرج من مذهبه لانه حينئذ يخلع ويبقى سدى مهملا (الانصاف:ص۷۹)

غرض بحالات موجودہ عامی شخص کے لیے شریعت پر عمل کرنے کے لیے واحد صورت یہ ہے کہ وہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کرے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔

''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

ان هذه المذاهب الاربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الامة اى من يعتد منها على جواز تقليد ها الى يومنا هذا وفى ذلك من المصالح مالايخفى لاسيما فى هذه الايام التى قصرت فيها الهمم جدا واشربت النفوس الهوىٰ واعجب كل ذى رائى برأئه (ص۱۵۴/ر)

ترجمہ: مذاہب اربعہ جو آج تحریری صورت میں موجود ہیں، پوری امت یا کم ازکم امت کے قابل لحاظ طبقہ کا آج تک ان کی تقلید کے جواز پر اتفاق رہا ہے، ان میں جو مصالح واسرار ہیں، بالخصوص موجودہ حالات میں جب کہ ہمتیں کوتاہ ہیں، ہویٰ پرستی کا دور دورہ ہے، اور ہر شخص اپنی رائے پر نازاں ہے، وہ مخفی نہیں''

اس طرح شاہ صاحبؒ نے تقلید کے تمام گوشوں پر محققانہ کلام کیا ہے، اور اس

پروارد ہونے والے تمام اشکالات کا بھی ازالہ کردیا ہے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ غیر مقلد تھے، حیرت ہے تقلید کی اتنی مدلل اور محقق وکالت کرنے والا شخص غیر مقلد کیوں کر قرار پاسکتا ہے، صحیح ہے کہ شاہ صاحبؒ نے بعض چیزوں میں مذہب حنفی سے اختلاف کیا ہے، لیکن جب امام بخاریؒ مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور عباس الاصم اپنے مذہب سے بعض اختلافات کے باوجود شاہ صاحبؒ کے نزدیک دائرہ تقلید سے خارج نہیں ہیں، یہاں تک کہ ابن جریر طبریؒ اپنے شدید اختلافات کے باوجود مذہب شافعی سے خارج نہیں ہیں، (جب کہ بعض علماء نے طبری کو شافعیہ سے خارج قرار دیا ہے، مگر شاہ صاحبؒ کو اس سے اختلاف ہے، ان کے نزدیک طبری کا شمار شافعیہ ہی میں ہونا چاہئے،)(الانصاف: ص ۷۶/) تو پھر شاہ صاحبؒ اپنے بعض اختلافات کی بناپر مذہب حنفی سے خارج کیسے قرار پا سکتے ہیں؟

پھر اگر شاہ صاحبؒ کے نزدیک تقلید اور بالخصوص ائمہ اربعہ کی تخصیص اتنی ہی غیر ضروری چیز ہوتی تو ''الانصاف'' میں مستقل یہ باب قائم نہ فرماتے۔

''باب تاکید الاخذ بهذه المذاهب الاربعة والتشديد فی ترکها والخروج عنها''

یعنی مذاہب اربعہ کی تقلید ضروری ہے اور ان سے خروج سخت گناہ ہے۔

اس باب کے تحت شاہ صاحبؒ نے مختلف وجوہ سے ثابت کیا ہے کہ ان مذاہب اربعہ کی تقلید کیوں ضروری ہے؟ ارباب نظر کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

۸

اختلافات فقہاء کی بحث:

رسول اکرم ﷺ کے بعد صحابہ میں سیاسی اختلافات کے علاوہ شدید علمی اور نظریاتی اختلافات بھی رونما ہوئے، پھر یہ سلسلہ امت میں تاریخ کے ہر دور میں رہا، تابعین اور ائمہ مجتہدین میں اختلافات ہوئے، ....صحابہ اور علماء کا اختلاف ایک نازک اور حساس مسئلہ ہے، اگر بہت زیادہ احتیاط نہ کی جائے تو اکثر لوگوں کے قدم پھسلنے کا سخت اندیشہ ہے، کتنے افراد اور جماعتیں صرف اس مسئلہ کی بنیاد پر افراط وتفریط کی شکار ہوئیں، اور گمراہ قرار پائیں، ....ایک احساس یہ بھی ابھرتا ہے کہ صحابہ اور علماء جیسی مقدس جماعت میں آخر اختلاف کیوں ہوا؟ اختلاف تو بظاہر اچھی چیز نہیں ہے، پھر ایسی آئیڈیل جماعت میں یہ چیز کیونکر آئی؟ اس کے اسباب ووجوہ کیا تھے؟

حضرت شاہ صاحبؒ کے حساس اور محتاط قلم نے اس موضوع کا بھی حق ادا کیا ہے، ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اور ''الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف'' میں شاہ صاحبؒ نے صحابہ و تابعین اور فقہاء کے اختلافات کی حقیقت اور اس کے اسباب ووجوہ پر سیر حاصل اور بصیرت افروز بحث کی ہے، پوری تفصیل کے لیے اصل کتاب کی طرف ہی مراجعت کرنی چاہیئے، البتہ بعض اہم نکتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کا باہمی اختلاف دین کے اصول اور اساسیات میں نہیں، بلکہ فروعی اور جزوی مسائل میں، جس سے منشاء الٰہی یہ ہے کہ امت کے لیے کئی راہیں کھول دی جائیں، اور اس کے لیے توسع پیدا کیا جائے، اسی لیے ایک حدیث میں صحابہ کے اختلاف کو انسانیت کے لیے رحمت قرار دیا گیا ہے، علامہ سخاوی نے ''المقاصد الحسنۃ'' میں بیہقی کی ''المدخل'' کے حوالے سے نقل کیا ہے:

ان اصحابی بمنزلة النجوم فی السماء فایما اخذتم به اهتدیتم

واختلاف اصحابی لکم رحمۃ. (المقاصد الحسنۃ:ص۱۲/ر)

ترجمہ: یقیناً صحابہ آسمان کے ستاروں کے مانند ہیں (کہ ان کی منزلیں اور روشنی کی نوعیتیں جداگانہ ہیں) پس ان میں سے جس کو بھی پکڑلو گے ہدایت پا جاؤ گے، اور میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لیے رحمت ہے۔

خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے منقول ہے:

ماسرنی لوان اصحاب محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم لم یختلفوا لانهم لولم یختلفوا لم تکن رخصۃ. (المقاصد الحسنۃ:ص۱۲/ر)

ترجمہ: مجھے اس کی تمنا نہیں کہ صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا، کیونکہ صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا تو ہمارے لیے آسانی نہ ہوتی۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح آج ہمارے لیے مسائل اور احکام کتابوں میں مدون طور پر موجود ہیں اور تمام احکام کے مدارج مقرر ہیں کہ یہ فرض ہے، یہ واجب ہے، یہ جائز ہے، حرام ہے، ناجائز ہے، مکروہ ہے، اس طرح کی کوئی مدون فقہ عہد صحابہ میں موجود نہیں تھی اور نہ صحابہ ان تفصیلات وتشقیقات کے درپے رہتے تھے، حضور اکرمؐ نے ان سے فرمایا تھا:

''مجھے جس طرح کرتے ہوئے دیکھتے ہو نماز پڑھو!''

اب ان کے لیے کہاں گنجائش کہ ایک ایک بات حضور سے دریافت کریں، کہ نماز میں فرائض کتنے ہیں؟ اور واجبات ومستحبات کتنے؟ یا وضو میں کون سا عمل سنت ہے اور کون سا فرض؟ وہ صرف انتظار کی کیفیت میں رہتے تھے، کہ حضورؐ کوئی عمل کریں تو اس کو دیکھیں، یا کوئی اعرابی حضورؐ کے پاس آکر سوالات کرے تو ان کی معلومات میں اضافہ ہو، صحابہ حضورؐ سے سوالات کے باب میں کافی محتاط تھے اسی لیے حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ:

''میں نے اصحاب رسولؐ سے بہتر کوئی جماعت نہیں دیکھی، انہوں نے حضور ﷺ

سے کل تیرہ سوالات کئے اوروہ سارے کے سارے قرآن میں محفوظ کردیئے گئے،''**یسئلونك عن الشهر الحرام،يسئلونك عن المحيض** ،وغیرہ صحابہ صرف مفیداورضروری باتیں ہی دریافت کرتے تھے،غیرضروری سوالات سے گریز کرتے تھے۔

(حجۃ اللہ البالغۃ :ص ۱۴۱ر)

حضرت قاسمؒ فرماتے تھے کہ تم لوگ ایسی چیزوں کے بارے میں سوالات کرتے ہو اور تحقیق وتفتیش کرتے ہوجن کے بارے میں ہم نہیں کرتے تھے،تم لوگ ایسے سوالات کرتے ہوجوہمارے علم میں نہیں ہوتے،اگروہ ہمیں معلوم ہوں توہمارے لیےان کاچھپانا جائزنہ ہو''۔

اور جب معاملہ صرف دیکھنے اورازخودجاننے پرموقوف ہو،مزیدسوالات کاموقعہ ہی نہ ہوتوجس صحابی نے جس چیزکودیکھامحفوظ رکھا،اوراپنے اجتہاداورفکرسے اس کی کوئی شرعی حیثیت مقررکرلی، ہرصحابی اپنے مشاہدہ اورعلم کا پابندتھا، ہرایک کوستارۂ ہدایت قراردیاگیاتھا،عہدنبوت میں کسی فقہی مسئلہ پر باہم مذاکرہ اورمباحثہ کی نوبت بھی کم ہی آتی تھی، رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ تک یہی صورت حال برقراررہی،عہدنبویؐ کے بعدصحابہ اقطارعالم میں پھیل گئے، پھران سے مسائل اورحوادث دریافت کئے گئے،صحابہ نے حضورؐ سے جوکچھ دیکھااورسناتھاوہ محدودتھا،اورحوادث وواقعات لامحدودتھے، پھرہرصحابی کوحضورؐ کی ہرہرچیزدیکھنے کاموقعہ نہیں ملاتھا،ایک نے ایک چیزدیکھی اورسنی تودوسرے کواس کاعلم نہیں تھا،پھردیکھنےاورسننے والوں میں بھی اس چیزکی شرعی حیثیت کی تعیین میں اختلاف ہوا، کیونکہ حضورؐنے مدارج اورحیثیتوں کی صراحۃً تعیین نہیں فرمائی تھی، یہ صحابہ کوخوداپنی صوابدید سے قرائن وحالات کی روشنی میں طے کرناتھا،یہی وہ بنیادی اسباب تھےجن کی بناپرصحابہ میں فردعی اختلافات ہوئے،جن کی بنیادمکمل اخلاص،رضائے الٰہی کی طلب اورفکرواجتہاد

پرتھی، اگرہم ان اسباب اوران سے پیداشدہ اختلافات کا تجزیہ کریں تو کئی صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، مثلاً:

☆ بہت مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی صحابی نے اپنے اجتہاد سے کوئی مسئلہ بتایا جب کہ اس سلسلے میں دوسرے صحابی کے پاس حدیث موجود تھی، جس کا مذکورہ صحابی کوعلم نہیں تھا، اوران کا اجتہاد حدیث کے خلاف تھا، پھر جب ان کو حدیث کا علم ہوا تو فوراً اپنے اجتہاد سے رجوع فرمالیا، مثلاً حضرت ابوہریرہؓ کا مذہب تھا کہ کوئی شخص صبح تک جنابت کی حالت میں رہے تو اس دن کا روزہ نہیں ہوگا، بعض ازواج مطہرات نے ان کو اس موقف کے خلاف حدیث رسولؐ بتائی تو انہوں نے اپنے مذہب سے رجوع کرلیا۔ (ص:۱۴۲ر)

☆ اگر صحابی کا اجتہاد حدیث رسولؐ کے مطابق ہوتا تو ان کو کافی مسرت ہوتی، مثلاً نسائی وغیرہ میں حضرت ابن مسعودؓ کے بارے میں مروی ہے کہ ان سے ایک ایسی عورت کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا گیا، جس کے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا، اوراس کا مہر دین مقرر نہیں تھا، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا مجھے اس مسئلے میں حضورؐ کا کوئی فیصلہ معلوم نہیں، لیکن متعلقین واقعہ کا اصرار ہوا کہ حضرت اس سلسلے میں کوئی رہنمائی فرمائیں، قریب ایک ماہ تک وہ لوگ حضرت ابن مسعودؓ کے پاس دوڑتے رہے، اورحضرت خاموش رہے، بالآخر حضرت ابن مسعودؓ نے اپنے اجتہاد سے فیصلہ فرمایا کہ ایسی عورت کو مہر مثل ملے گا، نہ کم نہ زیادہ، اس پرعدت واجب ہوگی، اوروہ وراثت کی حقدار ہوگی، اتفاق سے جس مجلس میں حضرت ابن مسعودؓ نے یہ فیصلہ کیا اس میں صحابی رسول حضرت معقل بن یسارؓ بھی موجود تھے، انہوں نے کھڑے ہوکر فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اسی قسم کے ایک واقعہ میں حضوراکرمؐ نے بالکل یہی فیصلہ فرمایا تھا، یہ سن کر حضرت ابن مسعودؓ اتنے خوش ہوئے کہ نعمت اسلام سے سرفراز ہونے کے بعد اتنی خوشی کبھی ان کو حاصل نہیں ہوئی تھی، (ص:۱۴۲ر)

☆ کبھی ایسا ہوا کہ صحابی کو حدیث ایسے طورر پر یا ایسے ذریعہ سے پہونچی

جس سے ان کو شرح صدر نہیں ہوا اور اس کی بنیاد پر وہ اپنے اجتہاد کو ترک نہ کر سکے، مثلاً حضرت عمر بن الخطابؓ کی رائے تھی کہ جنبی کے لیے تیمّم جائز نہیں، حضرت عمار بن یاسرؓ نے ان کو ایک سفر کا واقعہ یاد دلایا، کہ ہم دونوں ساتھ تھے، اور ان کو جنابت پیش آ گئی تھی، اور پانی نہیں مل سکا تھا، تو انہوں نے غسل پر قیاس کر کے پورے بدن میں مٹی کی مالش کر لی، اور نماز ادا کر لی، پھر حضورؐ کے سامنے اس کا ذکر آیا، تو حضورؐ نے فرمایا اتنا کرنے کی ضرورت نہ تھی، صرف اس قدر کافی تھا، اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے، اور اپنے چہرہ اور ہاتھوں پر مسح فرمایا، مگر حضرت عمر کو اس روایت پر اطمینان نہ ہوا اور وہ اپنے اجتہاد پر قائم رہے۔ (ص:۱۴۲ر)

☆ کبھی سہو و نسیان بھی اختلاف کا سبب بنا ہے، مثلاً حضرت ابن عمرؓ فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں عمرہ فرمایا، حضرت عائشہؓ نے یہ سنا تو اس کو ابن عمرؓ کی بھول قرار دیا۔

☆ کبھی اختلاف اس بنیاد پر ہوا کہ ایک صحابی نے ایک حدیث ایک طرح سے محفوظ کی، اور دوسرے صحابی نے دوسری طرح سے، مثلاً حضرت ابن عمرؓ یا حضرت عمرؓ حضور اکرمؐ سے روایت کرتے تھے ''ان المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ'' کہ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی بنا پر عذاب دیا جاتا ہے، حضرت عائشہؓ نے یہ روایت سنی تو فرمایا کہ انہوں نے واقعہ صحیح طور پر محفوظ نہیں کیا، واقعہ دراصل یہ تھا کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ ایک یہودیہ کی قبر کے پاس سے گذرے جس کے مرنے پر اس کے گھر والے رو رہے تھے، تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ اس کے لے رو رہے ہیں، حالانکہ اس کو قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے، تو راوی نے یہ سمجھا کہ یہ عذاب اس کو گھر والوں کے رونے کی بنا پر ہو رہا ہے، اور پھر اس کو ہر میت کے لیے عام قاعدہ کے طور پر بیان کرنا شروع کر دیا، (ص:۱۴۳ر)

☆ کبھی اختلاف علت حکم کی تعیین کے مسئلے پر ہوا، مثلاً جنازہ کو دیکھ کر

کھڑے ہونے کا حکم کس وجہ سے ہے؟ ایک رائے یہ تھی کہ ملائکہ کی تعظیم کی بنا پر ہے، اس علت کے مطابق جنازہ خواہ مومن کا ہو یا کافر کا، ہرایک کے لیے یہ حکم عام ہے، دوسری رائے یہ ہے کہ حکم موت کی ہولناکی کے پس منظر میں دیا گیا ہے، اس لحاظ سے بھی یہ حکم عام ہوگا، ایک تیسری رائے حضرت حسن بن علی کی ہے کہ دراصل حضور ایک جگہ تشریف فرما تھے کہ وہاں سے ایک یہودی کا جنازہ گذرا تو آپ اس لیے کھڑے ہوگئے کہ کافر کی لاش آپ کے سر مبارک کے اوپر سے نہ گذرے، اس علت کے مطابق یہ حکم صرف کافر کے جنازہ کے لیے ہے، (۱۴۳/۱)

☆ اختلاف کی ایک وجہ دومختلف روایات میں جمع وتطبیق بھی بنی، مثلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے سال متعہ کی اجازت دی، اوطاس کے موقعہ پر بھی اس کی اجازت تھی، اس کے بعد اس کوممنوع قرار دیا گیا، ان دومختلف حکموں کی توجیہ کرتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ حکم ممانعت بدستور باقی ہے، رخصت محض ضرورت کی بنا پر دی گئی تھی، پھر جب ضرورت ختم ہوگئی تو ممانعت کر دی گئی، جب کہ جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ رخصت اباحت تھی اور حکم نہی آنے کے بعد یہ اباحت منسوخ ہوگئی۔ (۱۴۳/۱)

غرض یہی وہ بنیادی اسباب تھے جن کی بنا پر صحابہ میں علمی، فکری، اوراجتہادی اختلافات ہوئے، مگر یہ اختلاف کسی نفسانیت یا خواہ مخواہ کے اصرار پر مبنی نہیں تھا، بلکہ اجتہاد واخلاص اور رضائے الٰہی کی طلب پر مبنی تھا، یہی وجہ تھی کہ جب بھی کسی صحابی کو ان کی رائے کے خلاف صحیح طور پر کوئی حدیث یا دلیل معلوم ہوئی انہوں نے اسی وقت اپنی رائے سے رجوع کرلیا، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

صحابہ کے اختلاف کے دوررس اثرات:

پھر صحابہ کا یہی اختلاف بعد کے ادوار میں منتقل ہوا، اورمختلف حلقوں نے اپنے

ذوق اور سہولت کے لحاظ سے مختلف صحابہ کا اثر قبول کیا، نقطۂ نظر کا اختلاف ہوا، شخصیات اور حالات کے لحاظ سے رجحانات میں فرق آیا، اور مختلف اجتہادی کوششوں کے نتیجے میں مختلف مکاتب فقہ وجود میں آگئے، مدینہ میں حضرت سعید بن مسیّب، اور سالم بن عبداللہ کا مسلک فقہی رائج ہوا، ان کے بعد زہری، قاضی یحییٰ بن سعید، اور ربیعہ بن عبدالرحمٰن کا دور رہا، مکہ میں عطاء بن رباح، کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی، بصرہ میں حسن بصری، یمن میں طاؤس بن کیسان اور شام میں مکحول کو درجۂ امامت حاصل ہوا۔

اس طرح بعد کے فقہاء کے لیے اختلاف کا راستہ کھل گیا، اور قرن اول کے بعد کثرت سے مجتہدین پیدا ہوئے، اور فروعی مسائل کو انہوں نے اسلام کے بنیادی اصول اور اساسی مزاج کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی، جس پر ہر علاقے کے اپنے حالات و ظروف اور پیشرو شخصیات کی چھاپ تھی، چونکہ اس علم کی بنیاد روایت پر ہے اس لیے اس کے لیے شجرۂ نسب کی صحت، اور اتصال بے حد ضروری ہے، اور اسی وجہ سے ہر بعد والے نے اپنے قبل والے سے علم حاصل کیا، جس کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ جس کو جس استاذ سے علم سیکھنے کا موقعہ ملا، اس نے بالعموم اس کے معیار کو قبول کیا، اور اس نے بھی اسی نقطۂ نظر سے واقعات کا مطالعہ کیا، جس سے کہ اس کے مشائخ نے کیا تھا، اور اجتہاد و استنباط میں اس نے بھی وہی منہج اختیار کیا جو اس کے اساتذہ کا تھا، اس طرح ہر علاقے کے علماء و فقہاء پر وہاں کے پیشرو اکابر و مشائخ کے اجتہاد کی چھاپ پڑی، اور یہی بنیادی سبب بنا فقہاء کے اختلاف کا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ''الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف'' میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اس پہلو کو مرکزی اہمیت دی ہے، اور اس پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

مثلاً حضرت امام مالکؒ کے مکتب فقہی پر حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابوہریرہؓ حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، اور تابعین میں

حضرت عروہؒ، حضرت سالمؒ، عکرمہؒ، عطاؒ، عبید اللہ بن عبید اللہؒ، اور دیگر فقہاء مدینہ کے اقوال و افکار کی چھاپ پڑی، مشہور ہے کہ امام مالکؒ اہل مدینہ کے اجماع کو حجت قرار دیتے تھے، اس لیے کہ مدنیہ ہر دور میں علماء اور فقہاء کا مرکز رہا ہے۔

امام مالکؒ ایسے ہی کسی متفقہ مسلہ کے بارے میں کہتے تھے:

السنة التی لا اختلاف فیها عندنا کذا و کذا۔

یعنی جس سنت میں ہمارے یہاں کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے اور یہ ہے"۔

کوئی مسئلہ خود علماء مدینہ کے درمیان اختلافی ہوتا تو وہ اپنے ذوق اجتہاد یا کثرت قائلین یا قیاس قوی یا کتاب وسنت کی کسی تخریج سے موافقت کی بنیاد پر انہی میں سے کسی قول کا انتخاب کرتے تھے، ایسے مواقع پر امام مالکؒ فرماتے تھے، "**هذا احسن ماسمعت**" یہ میرے سنے ہوئے اقوال میں سب سے بہتر قول ہے"۔

دوسری طرف حضرت امام ابوحنیفہؒ، اور سفیان ثوریؒ وغیرہ نے فقہاء کوفہ میں حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت شریح، حضرت شعبی، اور حضرت ابراہیم نخعی، کے اقوال و مجتہدات کا اثر قبول کیا، اسی کا اثر تھا کہ حضرت علقمہ نے شریک کے مسئلے میں حضرت مسروق کا میلان حضرت زید بن ثابتؓ کے قول کی طرف دیکھا تو کہا، "**هل احد منهم اثبت من عبدا للّٰه**" کیا ان میں کوئی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بڑھ کر بھی مضبوط عالم ہے؟"۔

حضرت شاہ ولی اللہ تو اس باب میں بہت آگے تک چلے گئے ہیں جس سے مکمل اتفاق ضروری نہیں، وہ کہتے ہیں:

وان شئت ان تعلم حقیقة ماقلناه فلخص اقوال ابراهیم من کتاب الآثار لمحمد رحمه اللّٰه تعالیٰ وجامع عبد الرزاق، ومصنف ابی بکر بن ابی شیبة، ثم قایسه بمذهبه تجده لایفارق تلك المحجة الافی مواضع

یسیرۃ وھوفی تلك الیسیرۃ ایضا لایخرج عماذھب الیہ فقھاء الکوفۃ. (الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف:ص۸ر)

ترجمہ: اگرتم میری بات کی حقیقت جاننا چاہتے ہوتو امام محمدؒ کی کتاب الآثار، جامع عبدالرزاق، اور مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ، سے حضرت ابراہیم نخعی کے اقوال کی تلخیص کرو، پھر امام ابوحنیفہؒ کے مذہب سے ان کا موازنہ کرو، تو چند مقامات کے سوا کچھ فرق محسوس نہ کروگے، اوران چند میں بھی وہ فقہاء کوفہ کے اقوال سے خروج نہیں کرتے"۔

یہی حال دیگر فقہاء کا بھی ہے، مدینہ کے محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب، مکہ کے ابن جریج، اورابن عیینۃ، کوفہ کے ثوری، اور بصرہ کے ربیع بن صبیح کے جومختلف اقوال کتب فقہ وحدیث میں ملتے ہیں اوران سے ان کے جن فقہی رجحانات کا اظہار ہوتا ہے اس میں بھی اس کی جھلک موجود ہے۔

فقہ شافعی پرمختلف مکاتب فقہ کے اثرات:

حضرت امام شافعی نے مالکی اورحنفی دونوں مکاتب فقہ سے استفادہ کیا، اسی لیے ان کے یہاں کافی تنوع ملتا ہے، مدنی روایات کا رنگ بھی ہے، اورکوفی فکر ونظر کا بھی، ایک طرف ان کے یہاں اجتہاد واستنباط کی گہرائی وگیرائی محسوس ہوتی ہے، تودوسری طرف روایات میں اختلاف کے وقت وہ اصح مافی الباب کواہمیت دیتے نظر آتے ہیں، وہ فقہ حنفی سے اس قدر متاثر ہیں کہ ساری دنیا کوفقہ میں امام ابوحنیفہؒ کی عیال کہتے ہیں، اورامام محمد کی توصیف وتحسین سے ان کی زبان نہیں تھکتی اوردوسری طرف مختلف اساتذہ سے استفادہ اور درپیش مقامی حالات کی بناپرفقہ حنفی سے سب سے زیادہ اختلاف کرنے والے بھی وہی ہیں، امام مالکؒ کی صحبت میں رہے اس کارنگ ایک تھا، امام محمد کی ہم نشینی میں آئے تورنگ کچھ اورہوا، اورمصر گئے توایک اورکیفیت پیدا ہوئی۔

فقہ حنبلی پرفقہ شافعی کا اثر:

رہے امام احمد تو انہوں نے زیادہ تر استفادہ حضرت امام شافعی سے کیا اور انہی کا رنگ ان پر حاوی رہا، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تو فقہ کو کسی مستقل مکتب فقہی کے بجائے فقہ شافعی کی ایک شاخ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، لیکن چونکہ ان کے مذہب کی تدوین امام شافعی کے مذہب کے ساتھ عمل میں نہیں آئی، اس لیے دونوں جداگانہ مذاہب قرار دیئے گئے، (الانصاف:ص۴۴ر)

اسی لیے ان کی رائے یہ بھی ہے کہ مذہب شافعی کا مفتی (خواہ وہ مجتہد فی المذہب ہو یا متبحر فی المذہب) اگر کسی مسئلہ میں اپنے مذہب کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی طرف مراجعت کی ضرورت محسوس کرے تو اس پر اولاً لازم ہے کہ وہ امام احمد کے مذہب کی طرف مراجعت کرے اس لیے کہ امام احمد امام شافعیؒ کے اجل تلامذہ میں تھے، علم اور دیانت دونوں لحاظ سے وہ امام شافعی کے جانشین تھے اور ان کا مذہب درحقیقت مذہب شافعی کی شاخ اور ایک قسم ہے۔

وعندی فی ذلك رای وهوان المفتی فی مذهب الشافعی سواء كان مجتهدافی المذهب او متبحرا فيه اذا احتاج فی مسئلة الی غيرمذهبه فعليه مذهب احمد رحمة الله فانه اجل اصحاب الشافعی علما وديانة ومذهبه عند التحقيق فرع لمذهب الشافعی رحمه الله تعالیٰ ووجه من الوجوه والله اعلم. (عقدالجید فی احکام الاجتہاد والتقلید:ص۴۲ر)

(۲) اختلاف فقہاء کا دوسرا سبب:

علاوہ ازیں جو اسباب صحابہ میں علمی اختلاف کے تھے وہ بعد کے فقہی اختلافات کے بھی باعث بنے، مثلاً اس دور میں تمام حدیثیں یکجا نہیں تھیں اس لیے ممکن ہے کہ کسی فقیہ تک کوئی حدیث نہیں پہونچی اور اس نے اپنے اجتہاد سے کام لیا، اور وہ اجتہاد حدیث کے مطابق ثابت نہ ہوا، مثلاً:

امام زہریؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ہندہ کو مستحاضہ کے بارے میں رسول ﷺ کی رخصت کا علم نہیں تھا، وہ بہت روتی تھیں اس لیے کہ وہ خود مستحاضہ تھیں اور نماز نہیں پڑھتی تھیں۔ (الانصاف:ص۴)

(۳) تعلیل وتوجیہ میں اختلاف:

یا روایت تو پہونچی مگر اس کی تعلیل وتوجیہ میں اختلاف ہوا، اور فقہاء میں زیادہ تر اختلاف اسی بنیاد پر ہوا، اس کی مثالیں عہد صحابہ اور عہد فقہاء میں بے شمار ہیں مثلاً قلتین کی روایت ہے۔

اذا کان الماء قلتین لم یحمل الخبث. (ترمذی رکتاب الطہارۃ)

ترجمہ: کہ پانی دو قلے ہو جائے تو نجاست نہیں اٹھاتا"۔

اس حدیث کے مطابق امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ دو قلہ پانی ماء کثیر ہے، حنفیہ دو قلہ پانی کو ماء کثیر نہیں مانتے بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو شاید قلتین کی حدیث نہیں پہونچی، اسی لیے انہوں نے اجتہاد سے قلتین کو ماء کثیر ماننے سے انکار کیا، خود شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا بھی یہی خیال ہے، الانصاف میں لکھتے ہیں:

مثاله حديث القلتين فانه حديث صحيح روى بطرق كثيرة معظمها ترجع الى الوليد بن كثير عن محمد بن جعفر بن الزبير اومحمد بن عباد بن جعفر عن عبيد الله بن عبد الله عن ابن عمر ثم تشعبت الطرق بعد ذلك وهذان وان كا نا من الثقات لكنهما ليسامن وسد اليهم الفتوىٰ وعول الناس فلم عليهم يظهر الحديث فى عصر سعيدبن المسيب ولا فى عصر الزهرى ولم يمش عليه المالكية ولاالحنفية فلم يعملوا به وعمل به الشافعي. (ص:۹-۱۰)

مگر یہ خیال صحیح نہیں، واقعہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے بھی یہ روایت تھی مگر اس

روایت کے معنوی اور متنی اضطراب کی بنا پر انہوں نے اس کو حجت نہیں مانا، نیز اس روایت کی توجیہ ان کے نزدیک وہ نہیں تھی جو امام شافعیؒ نے کی ہے، بلکہ ان کی توجیہ یہ تھی، (جو خود روایت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے) کہ اس حدیث میں پانی سے مراد ارض حجاز کا مخصوص پانی ہے جو کہ مکہ اور مدینہ کے راستے میں بکثرت پایا جاتا تھا، یہ پہاڑی چشموں کا پانی تھا جو اپنے معدن سے نکل کر نالیوں سے بہہ بہہ کر چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں جمع ہو جاتا تھا، اور اس کی مقدار عموماً قلتین سے زائد نہیں ہوتی تھی، لیکن یہ پانی جاری ہوتا تھا اس لیے حضورؐ نے فرمایا کہ وہ نجس نہیں ہے، اس کی تائید روایت کے ابتدائی الفاظ سے ہوتی ہے کہ:

"وهو يسئل من الماء يكون في الفلاة من الارض ومابينوبه من السباع والدواب"

یعنی سوال ایسے پانی کے بارے میں تھا جو صحرائی زمینوں میں پایا جاتا تھا، جس پر درندے اور جانور آتے رہتے تھے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں گھڑے یا مٹکے میں پائے جانے والے پانی کے بارے میں سوال نہیں ہو رہا ہے، بلکہ صحراؤں کے پانی کے بارے میں سوال ہو رہا ہے، اور تحدید نہیں بلکہ بیان واقعہ ہے، یہ تشریح خود حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اپنے شاگرد حضرت امام ابو یوسفؒ سے کی تھی۔

اذا كان الماء قلتين لم يحمل الخبث اذا كان جاريا.

(درس ترمذی: ج ا ص ۲۷۷ مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب)

(۴) ردو قبول کے معیار میں اختلاف:

روایات کے ردو قبول کے معیار میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا، بعض فقہاء نے علو سند کو اہمیت دی، بعض نے راویوں کے علم وفقہ کو، اس کا اندازہ امام ابوحنیفہؒ اور امام

اوزاعیؒ کی اس گفتگو سے ہوتا ہے، جو مبسوط اور متعدد کتب فقہ وسیر میں مذکور ہے، (اور شاہ صاحبؒ نے متعدد جگہوں پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے) کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام اوزاعیؒ کی ملاقات مسجد حرام میں ہوئی، امام اوزاعیؒ نے کہا کیا بات ہے اہل عراق رکوع کے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے جب کہ مجھ سے زہریؒ نے "سالم عن ابن عمر" کی سند سے یہ حدیث بیان کی کہ حضور ﷺ ان دونوں وقتوں میں رفع یدین فرماتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: مجھ سے حماد نے **ابراھیم نخعی عن علقمة عن عبد اللّٰہ بن مسعودؓ** کی سند سے یہ حدیث روایت کی کہ نبی کریم ﷺ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے، اس بعد پھر رفع یدین نہیں فرماتے تھے، ....اس پر امام اوزاعی نے برہم ہوکر کہا، تعجب ہے ابوحنیفہ آپ پر! میں "**زھری عن سالم**" کی سند سے روایت کر رہا ہوں اور آپ مجھ سے "**حماد عن ابراھیم**" کی سند سے حدیث بیان کرتے ہیں؟ ان کا اشارہ علو سند کی طرف تھا، ....امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا حماد زہری سے زیادہ فقیہ تھے، اور ابراہیم سالم سے بڑے فقیہ تھے، اور اگر ابن عمر کو شرف صحبت حاصل نہ ہوتا تو میں کہتا کہ علقمہ ان سے بڑے فقیہ تھے، اور عبداللہ تو عبداللہ ہی ہیں، یعنی انہوں نے راویوں کی فقاہت اور دقت نظر کو وجہ ترجیح بتایا، اس پر اوزاعی خاموش ہو گئے۔

(اعلاء السنن: ج ۳ ص ۵۹)

(۵) روایات کے جمع وتطبیق میں اختلاف:

کبھی روایات کے جمع وتطبیق میں اختلاف ہوا، مثلاً حضور اکرم ﷺ نے حالت استنجاء میں استقبال قبلہ سے منع فرمایا، اور حضرت جابر نے وفات نبویؐ سے ایک سال پیشتر حضورؐ کو قبلہ کی طرف رخ کر کے استنجاء کرتے ہوئے دیکھا اور حضرت ابن عمرؓ نے حالت استنجاء میں حضورؐ کی پشت قبلہ کی طرف اور رخ شام کی طرف دیکھا.........اب ان روایتوں

کی جمع وتطبیق میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا، امام شعبیؒ اور کئی فقہاء نے کہا کہ نہی صحراء کے ساتھ خاص ہے، اس لیے آبادی یا بند مقام میں استقبال واستدبار میں مضائقہ نہیں، جب کہ امام ابوحنیفہؒ اور متعدد فقہاء کے نزدیک یہ حکم امتناع عام محکم ہے، اور حضورؐ کے عمل میں آپ کی خصوصیت کا احتمال ہے، (الانصاف: ص۵)

غرض مختلف اسباب تھے، جن کی بناپر فقہاء کے درمیان اختلافات ہوئے، اور مقصد صرف ایک تھا، یعنی رضائے الٰہی کی جستجو، اور حقیقت حکم تک رسائی، معاذ اللہ کوئی ہویٰ وہوس یا طلب جاہ یا طلب مال مقصود نہیں تھا، اور یہی اللہ کی مرضی تھی، اور رسول اللہ ﷺ بھی اسی پر راضی تھے، اس لیے توثیق وتعریف کے انداز میں آپ نے اس کی پیش گوئی فرمائی۔

شیخ الاسلام امام ابوالفضل عبد الرحمٰن بن ابوبکر سیوطیؒ نے اپنی کتاب ''جزیل المواہب فی اختلاف المذاہب'' میں بیہقی کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کوئی حکم کتاب اللہ میں ہو تو اس پر عمل ضروری ہے کوئی اس کو چھوڑنے پر معذور نہیں سمجھا جائے گا، اور اگر کوئی حکم قرآن کریم میں نہ ہو تو پھر میری سنت ثابتہ پر عمل کرے، اگر میری سنت میں بھی نہ ملے تو اس بات پر عمل کرے جو میرے صحابہ فرمائیں، کیونکہ میرے صحابہ آسمانی ستاروں کے مانند ہیں، اس لیے جس کے قول کو بھی اختیار کروگے ہدایت پر رہوگے، اور میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لیے رحمت ہے۔ (تذکرۃ النعمان: علامہ محمد بن یوسف دمشقی: ص۴۹)

اختلافات فقہاء کی شرعی حیثیت:

البتہ یہاں ایک اہم ترین بحث یہ ہے کہ اگر فقہاء کا یہ اختلاف مرضی الٰہی کے مطابق ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امت میں کسی دور میں اس نظری اور فروعی اختلاف کو مٹانے کی کوشش نہیں کی گئی، تو اس اختلاف کی شرعی حیثیت کیا قرار پائے گی؟ کیا یہ

اختلاف، اختلاف حق وباطل ہے؟ یا اختلاف صواب وخطا؟ یا یہ کہ ہر پہلو حق وہدایت پر مبنی ہے؟

علماء کے یہاں یہ بحث آئی ہے، قاضی بیضاویؒ نے ''المنہاج'' میں قاضی عیاض نے ''شفاء'' میں علامہ محمد بن یوسف صالحی دمشقیؒ نے ''تذکرۃ النعمان'' میں اور دیگر کئی علماء نے اس سے تعرض کیا ہے، اور بہت ہی اہم علمی بحثیں کی ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں بھی یہ بحث آئی ہے، اور انہوں نے اپنے مخصوص فکر ومزاج کے مطابق اپنے خاص اسلوب میں ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید'' میں اس پر بہت اچھی روشنی ڈالی ہے، اور انتہائی مدلل اور فکر انگیز پیرایۂ بیان میں ایک نقطۂ اعتدال پیش کیا ہے۔

اس پر تو تمام ہی علماء حق کا اتفاق ہے کہ فروعی مسائل میں مجتہدین کا اختلاف حق و باطل کا نہیں ہے، یعنی اس کا کوئی پہلو باطل نہیں ہے، اس لیے کہ احادیث میں اجتہادی خطا پر بھی اجر کا وعدہ کیا گیا ہے، اور کوئی مبطل مستحق اجر نہیں ہوسکتا۔

البتہ علماء کے یہاں اس سلسلے میں بنیادی طور پر دو نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں:

(۱) یہ اختلاف صواب وخطا ہے، یعنی اختلاف کی صورت میں ایک مجتہد صواب پر ہے اور دوسرا خطا پر۔

(۲) یہ اختلاف عزیمت ورخصت ہے یا اختلاف افضل وغیر افضل ہے، یعنی ہر ایک حق پر ہے، صرف عزیمت ورخصت یا افضل وغیر افضل کا فرق ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ پہلی رائے جمہور فقہاء کی ہے، اور ائمہ اربعہ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔

ابن المعانی نے القواطع میں لکھا ہے کہ یہی امام شافعیؒ کا ظاہر مذہب ہے، المنہاج میں قاضی بیضاویؒ نے بھی اس کو امام شافعی کا قول صحیح کہا ہے، اور اپنا میلان بھی اس کی طرف ظاہر کیا ہے، لکھتے ہیں:

والمختار ماصح عن الشافعي ان في الحادثة حكما معينا عليه امارة من وجدها اصاب ومن فقدها اخطاء ولم يأثم. (عقد الجید: ص۳۲)

ترجمہ: لائق اختیار بات یہ ہے جو امام شافعیؒ سے صحیح طور پر ثابت ہے، کہ ہر واقعہ میں کوئی ایک معین حکم ہوتا ہے، جس کے لیے کوئی علامت موجود ہوتی ہے، جس نے اس علامت کو پالیا وہ صواب تک پہونچ گیا اور جو نہ پہونچ سکا وہ خطا پر ہے مگر گنہ گار نہ ہوگا''۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے امام شافعیؒ کے اس قول کی تفسیر قاضی بیضاویؒ سے مختلف کی ہے، فرماتے ہیں:

''اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر واقعہ میں کوئی ایک ہی مقررہ حکم ہے، جو صواب ہے، اور اس کے علاوہ خطاء بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر واقعہ میں ایک قول اصول اور طرق اجتہاد کے زیادہ موافق ہوتا ہے، جس پر دلائل اجتہاد سے کوئی ظاہری علامت موجود ہوتی ہے، جس نے ان اصول، طرق اجتہاد اور دلائل اجتہاد کی رعایت کی اس نے صحیح کیا، ورنہ غلطی کی، مگر گنہ گار نہ ہوگا، اس لیے کہ امام شافعیؒ نے ''کتاب الام'' کے اوائل میں تصریح کی ہے کہ عالم اگر عالم سے کہے کہ تم نے غلط کیا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے علماء کے شایان شان راستہ اختیار نہیں کیا اور اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، اور بہت سی مثالوں سے اس کو واضح کیا ہے، یا ان کے قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسئلہ میں خبر واحد موجود ہے تو جس نے حدیث پر عمل کیا وہ صواب پر ہے اور جس نے (لاعلمی میں) اس کے خلاف اجتہاد کیا وہ خطاء پر ہے، ''کتاب الام'' میں اس پر مفصل گفتگو موجود ہے۔ (عقد الجید: ص۳۲)

اس سے محسوس ہوتا ہے کہ گویا خود شاہ صاحبؒ کو بھی اس انتساب پر اطمینان نہیں ہے، اسی لیے وہ لکھتے ہیں:

والحق ان ما نسب الى الائمة الاربعة قول مخرج من بعض تصريحا تهم وليس نصا منهم. (عقد الجید: ص۳۲)

ترجمہ: حق بات یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کی طرف اس کا انتساب ان کی بعض تصریحات سے ماٴخوذ ہے، صراحۃً ان سے ثابت نہیں ہے۔

جب کہ دوسری طرف امام کردری نے ''صاحب مخول'' کے رد میں امام شافعیؒ کی طرف اس کے برعکس دوسری رائے منسوب کی ہے، امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے:

ان المجتهدين القائلين بحكمين متساويين بمنزلة رسولين جا ئا لبشر يعتين مختلفين و كلتاهما حق و صدق . (تذکرۃ النعمان للدمشقی: ص۵۳/)

ترجمہ: دو مجتہد جو دو مساوی حکم کے قائل ہوں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے دو رسول دو مختلف شریعتیں لے کر آئیں، اور دونوں ہی برحق ہیں''۔

دوسری رائے کے قائل امام ابو یوسفؒ، امام محمد بن حسن شیبانیؒ، ابوزید دبوسیؒ، قاضی ابوبکر باقلانیؒ، شیخ ابوالحسن اشعریؒ، قاضی میرؒ، قاضی ابومحمد الدارکیؒ، ابن شریح اور مام شعبیؒ ہیں، اور جمہور متکلمین اشاعرہ ومعتزلہ سے بھی یہی منقول ہے، علامہ مازری کی رائے بھی یہی ہے اور اسی کو انہوں نے اکثر فقہاء متکلمین، اور ائمہ اربعہ کا مسلک بتایا ہے، اس رائے کے مطابق مجتہدین کے دونوں جانب حق ہے کیونکہ اگر دونوں حق پر نہ ہوتے تو اجر نہ ملتا، یہ حقیقی خطا نہیں بلکہ افضلیت کی خطا ہے، حقیقی خطا جب ہے کہ قرآن وحدیث، اثر اور اجماع کے ہوتے ہوئے اجتہاد کرے، اور اجتہاد ان کے خلاف ہو کہ یہ مقبول نہیں۔

(تذکرۃ النعمان: ص۵۳/)

''شفاء'' میں قاضی عیاض کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے، فرماتے ہیں:

''مجتہدین کی حقانیت ہی ہمارے نزدیک صحیح اور درست ہے، اور شیخ سیوطیؒ نے اس کی شرح میں فرمایا ہے: کہ ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ ائمہ (ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ، سفیان ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ، اوزاعیؒ، اور ابن جریر) اور دوسرے ائمہ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں، (تذکرۃ النعمان: ص۵۳/)

قطب ربانی شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے، اپنی مشہور زمانہ کتاب ''میزان کبریٰ'' میں لکھتے ہیں:

ان جميع الائمة المجتهدين دائرون مع ادلة الشريعة حيث دارت وانهم كلهم منزهون عن القول بالرأى فى دين الله ومابقى لك عذر فى التقليد لاى مذهب شئت من مذاهبهم فانها كلها طريق الى الجنة ....وانهم كلهم على هدى من ربهم وانه ماطعن احد فى قول من اقوالهم الابجهله به. (میزان کبریٰ: ج ۱ رص ۵۵ ر)

ترجمه: ائمہ مجتہدین کوئی بات دلائل شرعیہ کی بنیاد پر کہتے ہیں، وہ اللہ کے دین میں محض اپنی رائے سے کوئی بات کہنے سے پاک ہیں، اس لیے ان مذاہب میں سے کسی بھی مذہب کی (جس کو تم پسند کرو) تقلید میں اب تمہارے لیے کوئی عذر باقی نہیں ہے، یہ تمام مذاہب جنت کی طرف لے جانے والے راستے ہیں اور یہ سب کے سب اپنے رب کی طرف سے حق وہدایت پر ہیں، اور جس نے بھی ان بزرگوں کے کسی قول پر طعن وتشنیع کیا ہے اس نے اپنی جہالت کا ثبوت دیا''۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ بھی بنیادی طور پر اسی کے قائل نظر آتے ہیں:

فلا بد ان يكونا حكمين لله تعالىٰ، احدهما افضل من الآخر كالعزيمة والرخصة. (عقد الجید: ص ۳۲ ر)

ترجمه: ضروری ہے کہ دونوں حکم اللہ ہی کے ہوں، ان میں ایک دوسرے سے افضل ہوں جیسے کہ عزیمت اور رخصت''۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مسئلہ کا بڑا ابصیرت افروز تجزیہ پیش کیا ہے۔

مسئلہ کا تجزیہ:

یہاں وہ اجتہاد زیر بحث نہیں جو صریح نص کے خلاف ہو، وہ تو بالیقین باطل ہے،

اسی طرح وہ اختلاف بھی موضوع بحث نہیں جس میں کسی ایک جانب قطعیت یا غلبۂ ظن کے ساتھ حق کا یقین ہوتا ہو اور وہ اختلاف بھی داخل گفتگو نہیں جس کے دونوں جانب عمل کرنے کی قطعی یا ظنی طور پر گنجائش ہو، جیسا کہ قرآت سبعہ یا الفاظ دعا میں اختیار دیا گیا ہے۔

یہاں صرف وہ اختلاف زیر بحث ہے جو فروعی مسائل میں ہو اور کسی کے پاس کوئی صریح نص اس سے متعلق موجود نہ ہو......بنیادی طور پر اس کی چار صورتیں ممکن ہیں۔

(۱) ایک مجتہد کے پاس حدیث موجود ہو اور دوسرے کو اس کا علم نہ ہو، اس صورت میں متعین طور پر ایک صواب پر ہے اور دوسرا خطا پر، لیکن یہ خطا چونکہ اختیاری نہیں ہے اس لیے اس پر گناہ نہ ہوگا۔

(۲) ہر ایک کے پاس کچھ احادیث اور آثار موجود ہوں، جن کی تطبیق یا ترجیح میں ان کے درمیان اختلاف ہو اور ہر ایک کا اجتہاد اسے الگ سمت میں لے جائے۔

(۳) احادیث و آثار متحد ہوں، لیکن ان کے الفاظ کی تفسیر، اصطلاحی تعریف، ارکان و شرائط کی تحدید، مناطی تخریج، تحقیق یا تنقیح، اور جزئیات پر کلیات کی تطبیق وغیرہ میں اختلاف ہو۔

(۴) اصول میں اختلاف کی بنا پر فروعات میں اختلاف ہو۔

مؤخر الذکر تینوں صورتوں میں چونکہ ہر مجتہد کا مأخذ تقریباً ایک ہے، اس لیے ہر ایک کو مصیب قرار دیا جائے گا، بس زیادہ سے زیادہ افضل وغیر افضل یا عزیمت و رخصت کا فرق ہوگا، کہ ہر ایک نے اپنی ذمہ داری پوری کی اور اپنی قوت اجتہاد اور نظر و فکر کو استعمال کر کے صحیح حکم تک پہونچنے کی کوشش کی، اور انسان اس سے زیادہ کا مکلّف نہیں۔

متعدد روایات و واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

(۱) جنگ بدر کے قیدیوں کے سلسلے میں حضرات صحابہ کرامؓ میں اختلاف رائے ہوا، حضرت ابوبکرؓ کی رائے فدیہ لینے کی تھی، اور نبی اکرم ﷺ نے اسی کو ترجیح دی،

جب کہ حضرت عمرؓ کی رائے قتل کرنے کی تھی، اللہ تعالیٰ نے دوسری رائے کو ترجیح دی، اور پہلی رائے کے بارے میں فرمایا:

لولا کتاب من اللہ لمسکم فیما اخذ تم عذاب عظیم . (انفال:۸/)

ترجمہ: اگر اللہ کی تقدیر میں یہ تمہارا عمل نہ ہوتا تو فدیہ لینے پر عذاب الٰہی نازل ہوتا۔

علامہ دمشقیؒ فرماتے ہیں کہ ''معلوم ہوا کہ حکمت خداوندی فدیہ لینا ہی تھی، اس لیے فدیہ کو حلال وطیب فرمایا'' کہ جو تم نے غنیمت میں حاصل کیا ہے اس کو کھاؤ، یہ حلال وطیب ہے، البتہ قتل افضل تھا، اور فدیہ جائز، صحیح دونوں تھے، اسی طرح مذاہب میں جو ترجیح ہوتی ہے اکثر افضل وغیر افضل کی ہوتی ہے، (تذکرۃ النعمان:۵۲/)

(۲) ایک موقعہ پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

فطر کم یوم تفطرون واضحاکم یوم تضحون (عقد الجید:۳۴/)

ترجمہ: تمہارا افطار اسی دن ہے جس دن تم افطار کرو، اور تمہاری قربانی اسی دن ہے جس دن تم قربانی کرو''۔

شاہ صاحبؒ نے اس ذیل میں خطابیؒ کی تشریح نقل فرمائی ہے:

ان الخطأ موضوع عن الناس فیما کان سبیله الاجتهاد ولو ان قوما اجتهدوا فلم یروا الهلال الابعد ثلاثین فلم یفطروا حتی استوفوا العدد ثم ثبت عندهم ان الشهر کان تسعا وعشرین فان صومهم وفطرهم ماض ولاشئی علیهم من وزرا وعتب وکذلك فی الحج اذا اخطؤا یوم عرفة فانه لیس علیهم اعادته ویجزئهم اضحاهم ذلك وانما هذا تخفیف من اللہ سبحانه ورفق بعباده (عقد الجید:۳۴/)

ترجمہ: اجتہادی امور میں لوگوں کی خطا معفوعنہ ہے، اگر ایک قوم نے چاند

دیکھنے کی کوشش کی اور چاندان کوتیس تاریخ سے قبل نظرنہیں آیا، اورانہوں نے افطارتیس کا عدد مکمل کرنے کے بعد کیا، پھر بعد میں یہ ثابت ہوا کہ مہینہ انتیس دن ہی کا تھا، توان کا روزہ اورعید درست ہوگئے، اوران پرکوئی گناہ اورعتاب نہیں ہوگا، یہی حکم حج کا بھی ہے، اگرعرفہ کے دن لوگوں سے غلطی ہوجائے تو ان پراس کا اعادہ واجب نہیں ہے، اوران کی قربانی درست ہوگی، یہ اللہ کی جانب سے بندوں کے لیے تخفیف اورسہولت ہے"۔

اس طرح کی گنجائشوں کی بہت سی مثالیں کتب روایات میں ملتی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فروعی اختلافات شریعت محمدیہ میں نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں، بلکہ اس میں بڑی وسعت رکھی گئی ہے، اوراس کے کسی جانب کی تغلیظ وتنکیر سے ہرممکن احتراز کیا گیا ہے۔

فروعی اختلاف دین میں توسع کی علامت:

اوراسکی وجہ یہ ہے کہ اس امت کوجس خصوصی امتیاز سے نوازا گیا وہ ہے قیاس واجتہاد کی اجازت، قرآن وحدیث میں بالعموم مسائل واحکام سے صرف اصولی طور پرتعرض کیا گیا ہے، جزئیات وفروع سے بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ ان کی تطبیق وتشریح امت کے اجتہادواستنباط پرچھوڑ دی گئی ہے، جب کہ بہت سے ایسے مسائل ہیں جن سے عہد نبویؐ میں بھی لوگ دوچار ہوتے تھے، مگران کے جواب میں بھی عموما اصولی اورکلی انداز بیان اختیار کیا گیا، اورجزئیات کوامت کے اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا گیا، دراصل جزئیات کی تعیین سے مسئلہ محدود ہوجاتا ہے، اورلوگوں کے لیے صرف ایک راہ عمل متعین ہوجاتی ہے، جب کہ اللہ نے اس دین کا عمومی مزاج توسع کا رکھا ہے، تنگی خدا کوپسند نہیں ہے، اسی لیے نبی کریم ﷺ دو باتوں میں سے ایسی بات کا انتخاب فرماتے تھے، جس میں عام لوگوں کے لیے سہولت ویسر کا پہلو غالب ہوتا اوراپنے نمائندوں کوبھی ہمیشہ اس کی تلقین فرماتے کہ: "تم کواس لیے بھیجا گیا ہے کہ تم لوگوں کی مشکلات آسان کرونہ اس لیے کہ ان کے لیے تنگیاں پیدا کرو"۔

اورصحابہ کرام پیغمبر اسلام کے مزاج سے پوری طرح واقف تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ

حضورؐ سے خواہ مخواہ کے فروعی سوالات نہیں کرتے تھے، بلکہ حضورؐ اپنی طبیعت سے جتنی باتیں ارشاد فرماتے انہی پر وہ قناعت کر لیتے تھے، انہیں علم کی طلب ضرور تھی وہ پیاس بھی رکھتے تھے، اسی لیے ان کو خواہش ہوتی تھی کہ کوئی دیہاتی مجلس نبویؐ میں حاضر ہو اور سوالات کرے تو نئی معلومات حاصل ہوں،.........لیکن خود سوالات کرنے کی ان میں ہمت نہیں تھی، وہ اس معاملے میں کافی محتاط تھے، اور سوائے ضروری باتوں کے وہ سوالات سے گریز کرتے تھے، قرآن نے ان کا ایک عمومی مزاج بنایا تھا۔

لاتسئلو ا عن اشیاء ان تبدلکم تسؤ کم الآیۃ. (بقرۃ)

تم ان چیزوں کے بارے میں سوالات نہ کرو کہ اگر کھول کر بیان کر دی جائیں تو تم کو بری معلوم ہوں۔

قرآن نے بنی اسرائیل کی وہ منفی تصویر بھی سامنے رکھی تھی، جس میں انہوں نے ایک واقعۂ قتل کی تحقیق کے لیے ''بقرہ'' سے متعلق بہت سی ناخوشگوار جزئیات حضرت موسیٰ سے دریافت کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کی ان کو سخت سزا ملی تھی۔

غرض اجتہاد اس امت کا خاصہ ہے اور اس کا لازمی نتیجہ فروعی اختلاف ہے اور روایات و واقعات بتاتے ہیں کہ اجتہادی اختلاف کی کسی صورت پر کوئی نکیر نہیں کی گئی، بلکہ اس میں ہمیشہ توسع کو راہ دی گئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجتہادی مسائل میں حق کو دونوں جانب دائر رکھا گیا ہے، اور کسی جانب تغلیط کی نسبت پسندیدہ نہیں ہے۔

فی الواقع علم الٰہی کے لحاظ سے اجتہادی اختلاف کا تجزیہ:

البتہ اگر اجتہادات کا تجزیہ اس بنیاد پر کیا جائے کہ فی الواقع بھی شارع کی یہی مراد ہے، کیا یہی علت شارع کی نگاہ میں بھی مدارِ حکم ہے؟ یا علم الٰہی میں اس کے سوا کوئی دوسرا معنی و علت مقصود ہے؟ اس لحاظ سے غیر متعین طور پر کسی ایک ہی کو مصیب مانا جاسکتا ہے، اس لیے کہ علم الٰہی میں کسی حکم کی کوئی ایک ہی بنیاد ہوسکتی ہے، فوائد و مصالح میں تعدد ممکن

ہے، مگر علتوں میں نہیں لیکن اگر اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو صراحۃ یا دلالۃ پابند کیا ہے کہ اگر نصوص یا ان کے مفاہیم میں اختلاف ہو جائے، تو وہ اجتہاد اور حقیقت حق تک رسائی کی ممکنہ کوشش کے لیے مامور ہے، اس وقت اگر مجتہدین میں اختلاف ہوتا ہے تو چونکہ ہر ایک نے حضورؐ کا عہد پورا کیا ہے، اور حضورؐ کے مقرر کردہ خطوط پر اپنے فرائض کی تکمیل کی ہے، اس لیے ہر ایک صواب پر ہے، اور اس کے اجتہاد نے جو راستہ اس کو دکھایا ہے، اس کی اتباع اس پر واجب ہے، جیسا کہ اندھیری رات میں اشتباہ قبلہ کے وقت تحری میں اختلاف کی صورت میں ہر ایک کو اپنی تحری پر عمل کرنا واجب ہے، اس لیے کہ ہر حکم اسی وقت واجب ہوتا ہے جب کہ وہ چیز پائی جائے جس پر وہ موقوف ہے، اشتباہ قبلہ کے وقت ادائے صلوٰۃ کا حکم تحری پر موقوف ہے، اس لیے تحری کے مطابق نماز کی ادائیگی واجب ہے، نابالغ بچے کی تکلیف بلوغ پر معلق ہے، اس لیے بلوغ کے وقت اس کی تکلیف واجب ہوگی، اسی طرح اختلاف نصوص، اختلاف معانی یا نص کی عدم موجودگی کی صورت میں حکم اجتہاد و استنباط پر معلق ہے، اس لیے اجتہاد کے مطابق حکم واجب ہوگا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس اہم نکتہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

اذا كان الامر على ذلك ففي كل اجتهاد مقامان احدها ان صاحب الشرع هل اراد بكلامه هذا المعنى اوغيره وهل نصب هذه العلة مدارا في نفسه حين ماتكلم بالحكم المنصوص عليه اولا فان كان التقريب بالنظر الى هذا المقام فاحد المجتهدين لا لعينه مصيب دون الآخر وثانيهما ان من جملة احكام الشرع انه صلى الله عليه وسلم عهد الى امته صريحاً اودلالةً انه متى اختلف عليهم نصوصه واختلف عليهم معاني نص من نصوصه منهم مامورون بالاجتهاد واستفراغ الطاقة في معرفة ما هو الحق من ذلك فاذاتعين عند مجتهد شئي من ذلك و جب

علیہ اتباعہ کما عهد الیهم انه متیٰ اشتبه علیهم القبلة فی اللیلة الظلماء یجب علیهم ان یتحرّوا ویصلوا الی جهة وقع تحریهم علیها فهذا حکم علقه الشرع بوجود التحری کما علق وجوب الصلوٰة بالوقت وکما علق تکلیف الصبی ببلوغه .

(عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید :ص ۳۶)

۹

فقہی مسائل میں شاہ صاحبؒ کا حکیمانہ تفکر:

حضرت شاہ صاحبؒ حکیم الاسلام تھے، ان کی فکر رسا، پوشیدہ علمی حقائق اور دقیق فنی نکتوں کی طرف اتنی تیزی اور درستگی کے ساتھ منتقل ہوتی تھی کہ عام تو عام، اچھے اچھے خاص لوگوں کا ذہن بھی حیران رہ جاتا تھا، ''حجۃ اللہ البالغۃ'' شاہ صاحبؒ کے اسی فکری اور فنی عروج کی شاہکار ہے، پوری کتاب علوم وافکار اور اسرار وحکم سے لبریز ہے، اور جن لوگوں نے کہا ہے درست کہا ہے کہ ''اسلامی لائبریری میں اس پایہ کی عقلی وفکری کتاب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے'' فقہی طور پر اس کتاب کو چاہے کوئی خاص امتیاز حاصل نہ ہو، لیکن فکری طور پر یہ ایک اہم ترین کتاب ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اپنے حکیمانہ تفکر کا استعمال فقہی ابواب میں کم کیا ہے، ''ازالۃ الخفاء'' المسوی اور مصفی میں زیادہ تر متقدمین کے طرز کے مطابق نقول پر اعتماد کیا ہے، البتہ تطبیق بین الحدیث والفقہ کا جو مخصوص ذہن آپ نے پایا تھا اس کے نمونے آپ کی تصنیفات میں بے شمار ملتے ہیں، اور ''الانصاف، عقد الجید، حجۃ اللہ البالغۃ، ازالۃ الخفاء، المسوی، اور مصفی اس نقطۂ نظر سے مثالی کتابیں ہیں۔

شاہ صاحبؒ کی حکیمانہ بصیرت اور اعتدال فکر کا اندازہ بالعموم اختلافی مسائل میں ہوتا ہے، یا جب کسی خاص مناسبت سے تاریخی تجزیے کی نوبت آتی ہے، .... مثال کے

طور پر ازالۃ الخفاء کی تیسری جلد میرے سامنے ہے، حضرت فاروق اعظمؓ کی شخصیت اور ان کی فقہ واجتہاد پر شاہ صاحبؒ کے قلم نے جو جواہر ریزے بکھیرے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے، بڑے اہم حقائق کی طرف شاہ صاحبؒ نے اشارے کئے ہیں، مثلاً:

☆ حضرت عمر فاروقؓ کی فقہ کو دیگر صحابہ کی فقہ سے وہی نسبت ہے جو آپ کے مصحف کو دیگر صحابہ کے مصاحف سے ہے، دیگر صحابہ کے مذاہب کی عمومیت کے ساتھ اتنی اشاعت نہ ہوئی جتنی مذہب فاروقی کی اشاعت ہوئی۔ (ص ۲۹۸)

☆ مجتہدین امت کے لیے آپ کی حیثیت وہی ہے جو مجتہدین منتسبین کے لیے مجتہد مستقل کی ہوتی ہے، آپ کو شرع میں واسطہ بنائے بغیر مجتہدین ادلۂ شرعیہ میں غور نہیں کر سکے ہیں، اہم مسائل فقہ میں مجتہدین فاروق اعظم کے مذہب کے تابع ہیں۔ (ص ۳۰۴)

☆ احادیث کی ترجیح و تطبیق میں مجتہدین نے حضرت عمرؓ کا اتباع کیا۔ (ص ۳۰۵)

☆ حضرت عمرؓ کے مسائل فقہ پر اجماع پایا جاتا ہے، ان کی زندگی میں لوگوں کو ان کے مسائل سے اختلاف کی جرأت نہ ہوئی، بعد میں اختلاف فہم اور روایت کی بنا پر جزئیات میں اختلاف ہوا، قریب ایک ہزار مسائل میں مجتہدین فاروق اعظمؓ کے تابع ہیں۔

''ازالۃ الخفاء'' میں حضرت عمر فاروقؓ کی فقہ پر مشتمل رسالہ ''فقہ عمر فاروقؓ'' کے نام سے موجود ہے، جو غالباً کسی صحابی کی فقہ پر پہلی موسوعہ ہے، بالخصوص حضرت فاروق اعظمؓ کی فقہ پر کام کرنے کی جتنی زیادہ ضرورت تھی، وہ علماء امت کے ذمہ قرض تھی، اس قرض کو غالباً پہلی بار حضرت شاہ صاحب نے چکایا۔

فقہ فاروقی کے بارے میں دو اہم نکتے:

اس رسالہ کے آخر میں شاہ صاحبؒ نے دو اہم نکتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہ

اہل علم کے لیے لائق توجہ ہیں۔

نکتۂ اولیٰ: شیخین کے زمانہ میں طریق اجتہاد وافتاء اور زمانۂ ماقبل اور مابعد کے مقابلے میں اس کی خصوصیات۔

اس عنوان کے تحت شاہ صاحبؒ رقم طراز ہیں:

''حضرت عثمان کے عہد خلافت تک افتاء وقضا میں خلیفہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، حضرت عمرؓ نے حضرت ابن مسعودؓ سے فرمایا تھا ''ول حارها من تولی قارها'' (یعنی تکلیف دہ کام انہی کے لیے چھوڑ دو جو اس سے راحت پانے والے ہیں) لیکن حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں انتشار ہوا، علماء وفقہاء کو انتظار رہا کہ خلافت منظّم ہو جائے لیکن جب ''خلافت خاصہ'' کے ایام بالکلیہ ختم ہو گئے، تو خلافت عامہ کا ظہور ہوا، اور اجتماع کی صورت بنی، اور علماء مختلف شہروں میں علمی کاموں میں مشغول ہو گئے، حضرت ابن عباسؓ مکہ میں، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ مدینہ میں فتوی وتفسیر کا کام کرتے تھے، ابو ہریرہؓ اور ابوسعید خدریؓ اور حضرت جابر روایت میں مشغول ہوئے، حضرت انسؓ اور عمران بن حصین بصرہ میں، براء بن عازب، (حدیث میں) اور ابن مسعودؓ (فقہ میں) کوفہ میں، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، ابو درداء اور ابو امامہ باہلی وغیرہ شام میں مصروف جہد وعمل ہوئے، اس طرح فتاویٰ میں اختلاف ہوا، اور ''اصحابی کالنجوم'' کے مقتضا کے مطابق لوگ عمل کرنے لگے۔

نکتۂ ثانیہ: حضرت عمرؓ روایت کے باب میں کافی محتاط اور سخت تھے، آپ قلیل الروایت مشہور ہیں، مگر اس سے مراد شمائل اور سنن ہدی کی روایات ہیں، جس سے اس دور میں لوگ بخوبی واقف تھے، اور ان کی خاص ضرورت بھی نہ تھی، شرائع کی روایات اس سے مراد نہیں ہیں، بعض علماء مثلاً ابو محمد الدارمی، وغیرہ نے اس کا مصداق مغازی کی روایات کو قرار دیا ہے، مگر شاہ صاحبؒ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ اس سے مراد شمائل وعادات کی

روایات ہیں، یا کوئی ایسی روایت جس کے حفظ اور فہم میں خود راوی کو بھی اطمینان نہ ہو۔

(ج:۳ر ص ۵۴ر)

طلاق ثلاثہ کے مسئلے پر شاہ صاحبؒ کا محاکمہ:

حضرت شاہ صاحبؒ نے اسی کتاب میں بعض اختلافی مواقع پر جو علمی محاکمے فرمائے ہیں، وہ بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں، اور اس سے شاہ صاحبؒ کی علمی واجتہادی شان، قوت فکر اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً:

۱۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کے زمانے اور خلافت فاروقی کے ابتدائی دو سالوں میں ''طلاق ثلاثہ'' کو ایک مانا جاتا تھا، لیکن پھر حضرت عمر بن الخطابؓ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ لوگ طلاق کے معاملے میں عجلت سے کام لے رہے ہیں، جب کہ اس معاملے میں بہت ہی زیادہ سنجیدگی، اور احتیاط مطلوب تھی، اس لیے آئندہ جو کوئی بھی تین طلاق ایک ساتھ دے گا اس کو ہم نافذ قرار دیں گے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس پر ایک سوال اٹھایا ہے، وہ یہ کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات اور سلسلۂ وحی کے انقطاع کے بعد کسی حکم کے منسوخ ہونے کا تصور نہیں کیا جا سکتا، پھر حضرت فاروقؓ نے ایک ایسے حکم کو جو عہد نبویؐ میں جاری تھا، اور عہد صدیقی میں بھی جاری رہا کیسے منسوخ فرما دیا؟ علامہ بغویؒ نے علماء کے تین جوابات نقل فرمائے ہیں:

۱۔ ایک جواب یہ ہے کہ ''انت طالق، انت طالق، انت طالق'' کوئی شخص یہ تینوں جملے ایک ساتھ دہرائے اور ہر جملے سے الگ الگ طلاق مراد ہو تو تین طلاق واقع ہوگی، لیکن اگر بعد کے دونوں جملوں سے پہلے ہی جملے کی تاکید واعادہ مقصود ہو تو اس سے ایک ہی طلاق واقع ہوگی، مسئلہ شرعی یہی ہے، عہد نبویؐ اور عہد صدیقی میں دیانت وامانت اور صدق وخیر کا غلبہ تھا، اس لیے اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ میں نے تاکید اور اعادہ کے مقصد سے ''انت طالق'' کے جملے کی تکرار کی ہے، تو اس پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی نیت کے مطابق

ایک ہی طلاق کا فیصلہ کیا جاتا تھا، لیکن جب حضرت فاروق اعظمؓ نے محسوس کیا کہ عام لوگوں میں اب دیانت وصداقت کا مادہ کمزور پڑتا جارہا ہے، اور ہویٰ وہوس کا غلبہ ہورہا ہے، تو محض نیت پر اعتماد کی بات قضاً ختم فرمادی، اور یہ فیصلہ فرمایا کہ قضاً فیصلہ صرف ظاہر حال کے مطابق دیا جائے گا، اور تین کو تین ہی مانا جائے گا، اور محض نیت وارادہ کی بنیاد پر اس کو ایک نہیں قرار دیا جائے گا۔

۲ دوسرا جواب یہ ہے اگر مرد اپنی غیر مدخول بہا بیوی کو ایک جملے میں کہے "انت طالق ثلاثا" تو حضرت ابن عباسؓ کے اصحاب وتلامذہ کی رائے یہ تھی کہ اس سے ایک ہی طلاق پڑے گی، جب کہ حضرت عمرؓ اور جمہور اہل علم کی رائے یہ تھی کہ ایک جملے میں تین بولنے سے تین طلاق ہی واقع ہوگی۔

۳ تیسرا جواب یہ ہے کہ "طلاق ثلاثه" سے مراد "انت بتة" کے لفظ سے طلاق دینا ہے، حضرت عمرؓ کی رائے پہلے یہ تھی کہ اس سے ایک طلاق واقع ہوگی، مگر جب بعد میں اس لفظ کا بیجا استعمال ہونے لگا، تو تین کا فیصلہ فرمایا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے علامہ بغویؒ کے یہ تینوں جوابات نقل کرنے کے بعد اپنی رائے یہ لکھی ہے کہ میرے نزدیک سب سے بہتر بات یہ ہے کہ آیت کریمہ "الطلاق مرتان" میں دو احتمالات ہیں ایک احتمال یہ ہے کہ "انت طالق ثلاثا" کو بظاہر کلمۂ واحدۃ ہونے کی بنا پر "مرۃ واحدۃ" سمجھا جائے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ معنی پر نظر رکھتے ہوئے اس کو یہ سمجھا جائے کہ اس نے "انت طالق" کا لفظ تین بار دہرایا ہے، اور محض اختصار کلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے "انت طالق ثلثا" کہہ دیا ہے، عہد نبویؐ اور عہد صدیقی میں آیت کریمہ کا مفہوم اس تجزیہ کے ساتھ عام لوگوں پر واضح نہیں ہوسکا، اس لیے عام طور پر احتمال اول کی بنیاد پر لوگ "انت طالق ثلثا" کو "مرۃ واحدۃ" قرار دے کر ایک ہی طلاق سمجھتے تھے، حضرت فاروق اعظمؓ نے اس مسئلے کو پوری طرح واضح کیا اور جب آپ کے

سامنے اس قسم کا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے دوسرے احتمال کی بنیاد پر اس کو تین طلاق قرار دیا۔ (رسالۃ فقہ عمر فاروقؓ، ازالۃ الخفاء، ص ۴۱۷-۴۱۹)

شاہ صاحبؒ کی تصنیفات اس قسم کے دقیق علمی وفقہی مباحث سے لبریز ہیں، اب تک جو کچھ پیش کیا گیا وہ اس کی محض ایک معمولی سی جھلک ہے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فقہ وحدیث کے موضوع پر شاہ صاحبؒ کی بعض اہم تصنیفات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

۱۰

فقہ کے موضوع پر شاہ صاحبؒ کی تحریری خدمات:

ایک مصنف کی حیثیت سے بھی شاہ صاحبؒ کا درجہ نہایت بلند ہے، زبان وبیان اور فکر ومعنی ہر لحاظ سے شاہ صاحبؒ کی تصنیفات ایک خاص امتیاز رکھتی ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں:

''شاہ ولی اللہؒ پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف میں اہل زبان کی سی روانی وقدرت اور عرب کی سی عربیت ہے، اور وہ ان بے اعتدالیوں سے پاک ہیں جو عجمی علماء کی عربی تحریرات میں پائی جاتی ہیں'' (تاریخ دعوت وعزیمت: ج ۵ رص.....)

شاہ صاحبؒ ایک نئے اسلوب کے بانی وموجد ہیں، جس کے اندر جامعیت، زور بیان، قوت اعتماد اور فصاحت وبلاغت میں نبی کریم ﷺ کے طرز کلام کی مشابہت پائی جاتی ہے۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''عربی زبان میں انہوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک خاص قسم کی انشا کی جوان کا مخصوص اسلوب ہے، پوری پابندی کی ہے، شاہ صاحبؒ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر ''جوامع الکلم النبی الخاتم ﷺ کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے، حتی

الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار انہی لغات اور انہی محاورات سے کریں جو لسان نبوت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں، (تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ)

آپ کے یہاں علم وتحقیق اور فکر ونظر کے ساتھ ساتھ بے پناہ سوز واخلاص اور دردمندی کے جوہر بھی پائے جاتے ہیں، ....اور خواہ حالات کیسے بھی ہوں آپ اپنی تصنیفات میں مرکزی نقطۂ خیال سے تجاوز نہیں فرماتے۔

علامہ سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''شاہ صاحبؒ کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جایئے، آپ کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ یہ بارہویں صدی ہجری کے پرآشوب زمانہ کی پیداوار ہے، جب ہر چیز بے اطمینانی اور بدامنی کی نذر تھی، صرف یہ معلوم ہوگا کہ فضل وعلم کا ایک دریا ہے، جو کسی شور وغل کے بغیر سکون وآرام کے ساتھ بہہ رہا ہے، جو زمان ومکان کے خس وخاشاک سے پاک صاف ہے۔ (ظفر المحصلین: ص ۶۳ر)

شاہ صاحبؒ کی تصانیف بہت ہیں، بعض مؤرخین دوسو سے زائد بتاتے ہیں، شاہ صاحبؒ کی تصنیفات کے سلسلے میں عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے یہ تمام کام جیسا کہ حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کل ستائیس اٹھائیس برس سے بھی کم مدت میں انجام دیئے ہیں، اور وہ بھی نہایت پرآشوب اور پرفتن زمانہ میں جو آپ کی منزلت علمی اور کمال فن کا ایک واضح ثبوت ہے۔

شاہ صاحبؒ نے متعدد علوم وموضوعات پر تصانیف چھوڑی ہیں، فقہ واجتہاد، اور فقہ الحدیث کے موضوع پر شاہ صاحبؒ کی بعض اہم تصنیفات یہ ہیں۔

۱ مصفیٰ شرح مؤطا، مؤطا امام مالک کی فارسی زبان میں بہترین شرح ہے، اس کے مطالعہ سے شاہ صاحبؒ کے اجتہادی اور استخراجی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، احادیث کی تحقیقات اس تبحر ولیاقت سے کی ہے جس سے آپ کا مجتہدانہ کمال صاف نمایاں ہوتا ہے۔

۲ موسیٰ شرح مؤطا: یہ عربی زبان میں ہے اور آپ کے اختیار کردہ طریقۂ درس حدیث کا نمونہ ہے، اصل میں مسویٰ کو بجائے خود ایک مستقل کتاب کہنا چاہئے، کیونکہ اس میں مؤطا کی حدیثوں کی تفصیل کے علاوہ بہت سے مسائل فقہیہ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔

۳ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید: یہ بھی عربی زبان میں ہے ایک مختصر رسالہ جس کا نام خود بتاتا ہے کہ اس میں اجتہاد وتقلید کے مباحث پر نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

۴ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف: یہ اپنے موضوع پر ایک نادر کتاب ہے ،اس میں صحابہ اور علماء اور فقہاء کے اختلاف کے اسباب ،نوعیت، اختلاف کی صورت میں اکابر کی روش اور عہد حاضر میں اس فقہی ذخیرہ کی شرعی اہمیت وافادیت پر ایسی مفصل گفتگو کی گئی ہے، جو کسی کتاب میں اس سے قبل اتنی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ نہیں آئی تھی، حجۃ اللہ کے بعض نسخوں میں اس کو اس کے ایک حصے کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔

۵ حجۃ اللہ البالغۃ: اس کتاب کو شاہ صاحبؒ کی تصنیفات میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے، ایسا لگتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کو یقین تھا کہ کچھ عرصہ بعد عقلیت کا دور شروع ہونے والا ہے،جس میں احکام شریعت کے متعلق اوہام وشکوک کی گرم بازاری ہوگی اسی خطرہ کا سد باب کرنے کے لیے محمد عاشق پھلتی کے اصرار پر شاہ صاحبؒ نے بالہام ربانی یہ بے نظیر کتاب ایسے عالم میں تحریر فرمائی جو محو واستغراق کا عالم تھا، یہ ایک دوسری صفت الہامی ہے جو شاید ان کی کسی دوسری کتاب میں موجود نہیں ہے ،خطبۂ کتاب میں اپنے استخارہ کا حال بیان فرماتے ہیں،"صرت کالمیتة فی ید الغسال "(میں اس بے جان لاشے کی طرح ہوگیا جو غسل دینے والوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے) جگہ جگہ کتاب میں لکھتے ہیں: "علمنی ربی ،الهمنی ربی"

یہ کتاب جس محدثانہ ،متکلمانہ ،فقیہانہ اور فلسفیانہ انداز میں تصنیف ہوئی ہے، وہ

حضرت شاہ صاحبؒ ہی کا حق تھا، اس کتاب میں آپ نے تعلیمات اسلام کو مطابق فطرت اور دینی احکام کو مبنی برعدل ثابت کیا ہے، ہر ہر حکم اور قانون شریعت کے اسرار و مصالح نہایت بلیغ اور مدلل انداز میں بیان کیے ہیں، جس سے تشکیک وتنقید کی جڑیں کٹ کر رہ جاتی ہیں۔

اس کتاب کا آغاز مابعد الطبیعی مسائل سے ہوا ہے، اور اس کے تحت شاہ صاحبؒ نے فلسفہ اسلام کو ایک مرتب شکل میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، قدرت کے قانونِ مکافات کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے، اس کے بعد ارتفاقات کے زیر عنوان اقتصادیات اور سیاسیات کے مسائل پر بحث کی ہے، پھر اخلاقیات کا موضوع لیا ہے، اور انسانی سعادت پر گفتگو کی ہے، اس کے بعد نظام شریعت اور اس کے عقائد وارکان پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اسرار وحکم بیان فرمائے ہیں، اور معاصی وآثام پر تفصیلی بحث کی ہے، بعد ازاں تاریخ مذاہب پر تبصرہ کیا ہے، اور تشریع وقانون سازی کے بارے میں نہایت مفید نکات بیان کیے ہیں، آخر میں آپ نے حدیث سے استنباط کا صحیح طریقہ بتایا ہے، اور فقہ سے متعلق بیش بہا معلومات بہم پہونچائی ہیں، دوسرے حصے میں فقہی طرز پر ابواب قائم کر کے شریعت کے جملہ احکام پر مفصل تبصرہ کیا ہے، اور ہر حکم کی علت، حکمت اور فوائد ومصالح بیان کیے ہیں، درحقیقت یہ کتاب امام غزالیؒ کی احیاء العلوم کے اسلوب اور مقاصد کی تکمیل کرتی ہے۔

۶۔ تاویل الاحادیث: مکذبین انبیاء پر جو عذاب آئے اور رسولوں کے ذریعہ جن معجزات کا ظہور ہوا، اس کتاب میں ان کو مطابق فطرت ثابت کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے، کہ وہ مخفی اسباب مادیہ کے باعث ظہور پذیر ہوئے، ان کا خلاف عادت ہونا محض ہماری کوتاہ نظری کی بنا پر ہے، ورنہ خدا تعالیٰ کا نظام کائنات نا قابل تغیر ہے۔

۷۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: حجۃ اللہ البالغۃ کی طرح یہ آپ کی دوسری معرکۃ الآراء تصنیف ہے، اس میں آپ نے خلفاء راشدین کی خلافت کو قرآن مجید، احادیث، تفسیر، تاریخ وغیرہ سے دلائل وبراہین پیش کر کے حق ثابت کیا ہے، اور شیعہ سنی باہمی اختلاف

کونہایت عدل اور توازن کے ساتھ حل کیا ہے، اثبات خلافت کے ساتھ ساتھ سیرت، تاریخ ،اورسیاست وخلافت کے بارے میں دیگر بیش بہا نکات بھی بیان ہوئے ہیں، انداز بیان نہایت شگفتہ اور سلیس ہے، حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی فرماتے ہیں کہ:

اس موضوع پر پورے اسلامی لٹریچر میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔

(ظفر المحصلین :ص ۱۶۵)

۸ قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین: (فارسی) اس کتاب میں خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی افضلیت بڑے حسین اور دلنشیں انداز میں بیان کی گئی ہے، اوراس سلسلے میں مکمل عقلی نقلی دلائل بھی پیش کئے گئے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے اول ایک ایسی کلی صفت بیان کی ہے، جو مدار افضلیت ہے، اس کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مخصوص صفت کامل طور پر حضرات شیخین یعنی حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ ہی میں تھی، ان کے ماسواء کسی صحابی میں یہ صفت پورے طور پر موجود نہیں تھی، شیخین پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کے الزامی اور تحقیقی جوابات بھی دیئے ہیں، اور ساتھ ہی حصرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب بھی درج فرمائے ہیں۔

کتاب کے خاتمے میں شاہ صاحبؒ نے اپنا مکاشفہ بیان فرمایا ہے، کہ ہم نے شیخین کی ارواح کو ایسی حالت میں پایا اور دوسرے صحابہ کی ارواح طیبہ کو اس کیفیت میں اور جب ہم نے اس کا روحانی سوال آنحضرت ﷺ کی روح پرفتوح سے کیا تو ہمارے دل پر القاء ہوا کہ یہی بات حق اور درست ہے، غرض اپنے موضوع پر یہ بھی ایک بے نظیر اور لاجواب کتاب ہے۔

۹ فیوض الحرمین: قیام حرمین کے دوران جو فیوض وبرکات بصورت خواب یا بطریق القاء آپ کو حاصل ہوئے یہ انہی کا مجموعہ ہے، بعض جگہ پیشین گوئیاں، علم تصوف کی تحقیقات اور دوسرے مسائل کا بھی ذکر ہے، یہ کتاب اگرچہ اصلاً تصوف اور مکاشفات کے

موضوع پر ہے مگر یہ کتاب اس لحاظ سے بھی خصوصی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے بعض مقامات سے آپ کے مسلک فقہی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، جیسا کہ اس کے بعض اقتباسات پچھلے صفحات میں نقل کئے گئے ہیں۔

۱۰۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین: عربی زبان میں یہ رسالہ اگرچہ ان بشارتوں سے تعلق ہے جو آپ کو یا آپ کے نسبی یا روحانی بزرگوں کو نبی کریم ﷺ سے ہوئی ہیں، مگر ہمارے موضوع سے بھی اس کو تعلق بایں طور ہے کہ اس میں ایک مقام پر شاہ صاحبؒ نے نقل فرمایا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی روح پرفتوح سے ان مذاہب فقہیہ کے بارے میں سوال کیا کہ ان میں سب سے لائق اختیار اور پسندیدہ مذہب کون ہے؟ تو میرے قلب پر آپ کی جانب سے یہ القاء ہوا کہ یہ تمام مذاہب فضیلت میں برابر ہیں، یعنی سب ہی پسندیدہ اور سب ہی لائق اختیار ہیں، (الرسائل الثلاث: ص ۱۵۸ر)

۱۱۔ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف: (فارسی) یہ شاہ صاحبؒ کی آپ بیتی ہے، اس کتاب سے بھی شاہ صاحبؒ کے مسلک فقہی کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

اس طرح شاہ صاحبؒ نے علمی دنیا کو فقہی طور پر اپنی تصنیفات سے کافی مالا مال کیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کی کتابوں کا غائرانہ مطالعہ انسان کے اندر اجتہادی شان پیدا کرتا ہے، اور فکری اعتدال اور توازن بھی بخشتا ہے۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

قابل مطالعہ چند اہم کتابیں

۱	حقوق انسانی کا اسلامی منشور	مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی	مطبوعہ
۲	غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اوران کا شرعی حل	// //	مطبوعہ
۳	منصب صحابہ	// //	مطبوعہ
۴	حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فقہی مقام	// //	مطبوعہ
۵	قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز	// //	زیر طبع
۶	موجودہ عہد زوال میں مسلمانوں کے لیے اسلامی ہدایات	// //	زیر طبع
۷	سیرت طیبہ کے بعض امتیازی پہلو	// //	زیر طبع

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ربانی منورواشریف، پوسٹ سوہما، وایا بتھان، ضلع سمستی پور (بہار) انڈیا

MAKTABA-H.JAMIA RABBANI MANORWA SHARIF
P.o, SOHMA. Via, BITHAN. Disst, SAMASTIPUR.
(BIHAR) INDIA 848207. Phon, 9431208629
E-mail: Jamia-rabbani @ maktoob. COM-